نصوح کا خواب

نصوح کا خواب

(مولوی نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح سے اخذ)

مرتّب

حفیظ عبّاسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔۱، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Nasoh Ka Khuwab

Edited By : Hafeez Abbasi

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1979

دوسرا اڈیشن : 2003 تعداد 1100

قیمت : -/20

سلسلۂ مطبوعات : 1126

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

طابع : فہمی کمپیوٹرس، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے بُرے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے مؤثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ اپنے بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تعارف

"**نصوح کا خواب**" ہے بڑے مزے کی کتاب۔ ایسی دلچسپ کہ شروع کر دیجیے تو ختم کرنے سے پہلے رکھنے کو جی نہ چاہے اور سبق آموز ایسی کہ دھیان سے پڑھیے تو عجب نہیں زندگی میں انقلاب آجائے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مزے دار ایک کہانی اور ہے ـــــ اس کے مصنف کی زندگی ایسی دلچسپ اور سبق آموز ہے کہ سننے تو دل میں ترقی کی امنگ پیدا ہو۔ آئیے لگے ہاتھوں یہ کہانی بھی سنتے ہی چلیے۔

نذیر احمد ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو یہی دیکھا کہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پہننے کو کپڑا ـــ باپ نے یہ کہہ کر ایک مولوی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ تھما دیا کہ یہ آپ کی خدمت کرے گا۔ اس بہانے کچھ پڑھ لکھ جائے گا۔ اس طرح یہ دہلی آپہنچے۔ پڑھنے کا شوق تھا، اسی دھن میں پھرتے پھراتے پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں آنکلے۔ مولوی صاحب کے دو چار شاگرد اور بھی تھے۔ مولوی صاحب اپنے شاگردوں کو پڑھاتے جاتے اور نذیر احمد ان کے پاؤں دباتے جاتے۔ ان بیچاروں کے کچھ سمجھ میں آتا ہو یا نہ سمجھ میں آتا ہو نذیر احمد کو سب زبانی یاد ہو جاتا۔ اللہ نے انھیں ذہن ہی ایسا دیا تھا۔

وہ خود کہتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے علاوہ ان کا ایک کام اور تھا ـــ روٹیاں سمیٹنا! دن نکلا اور یہ اس کام کے لیے نکل گئے۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال دے دی، کسی نے قیمے کی لگدی رکھ دی تو کسی نے سوکھی روٹی پر ہی ٹرخا دیا۔ ذرا دیر میں طرح طرح کا کھانا

جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اس گھر کا معاملہ بڑا بے ڈھب تھا۔ نذیر احمد نے دروازے میں قدم رکھا اور ان کی بیٹی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر دوسیر مصالحہ ان سے پسوا نہ لیتی گھر سے قدم نہ نکالنے دیتی۔ اپنے گھر کا مصالحہ پسواتی اور سارے محلّے سے مصالحے کی رکابیاں منگوا منگوا کے ان کے آگے ڈھیر لگا دیتی۔ پھر غضب یہ کہ انھوں نے ذرا ہاتھ روکا اور اس نے سل کا بٹہ مارا۔ اس مار سے ایسے ٹھیٹ پڑ گئے تھے کہ جیتے جی نہ گئے۔ آگے چل کر اسی لڑکی سے مولوی نذیر احمد صاحب کی شادی ہوئی۔ مولوی صاحب اسے انگلیوں کے ٹھیٹ دکھاتے کہ نیک بخت یہ سب تیری مار کے نشان ہیں تو وہ شرم سے دوہری ہو جاتی۔

گھر گھر جا کر روٹی مانگنے سے انھیں ایک فائدہ تو ضرور ہوا۔ وہ یہ کہ دہلی کی عورتوں کی زبان پر انھیں بڑا عبور حاصل ہو گیا اور دہلی کے محاورات زبانی یاد ہو گئے۔ اس سے انھوں نے حد سے زیادہ ہی فائدہ اٹھایا۔ ہم نے ان کا یہ انداز کسی حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ہاں تو نذیر احمد مولوی صاحب سے پڑھتے رہے۔ پہلے کلام مجید پڑھا۔ پھر ادب پڑھنا شروع کیا۔ علم کی طلب بڑھتی ہی گئی۔ پیاس تھی کہ دریا مانگتی تھی اور ملتا تھا قطرۂ شبنم۔ ایک دن کوچہ گردی کرتے کرتے کشمیری دروازے جا نکلے۔ یہاں دہلی کالج تھا اور اس میں آج بڑا ہنگامہ تھا۔ ایک مفتی صاحب زبانی امتحان لے رہے تھے۔ یہ بھی تماشا دیکھنے جا پہنچے۔ چھوٹا سا قد تھا۔ لوگوں کی ٹانگوں میں سے نکلتے ہوئے دروازے تک پہنچ ہی گئے۔ دیکھا کہ ایک بڑی سی میز بچھی ہے۔ اس کے ایک طرف مفتی صاحب بیٹھے ہیں۔ ایک ایک لڑکے کو بلا کے سوال کرتے ہیں اور کاغذ پہ کچھ لکھتے جاتے ہیں۔

میز کے دوسری طرف کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے۔ یہ کالج کے پرنسپل صاحب تھے۔ یہ کسی کام کے لیے باہر نکلے۔ چپراسی نے راستہ بتانے کے لیے لڑکوں کو دھکیلا۔ اس دھکا پیل میں نذیر احمد دھم سے گر پڑے۔ پرنسپل صاحب نے انھیں گرتے دیکھا تو دوڑ کر ان کے پاس پہنچے، زمین سے اٹھایا اور بڑی شفقت سے پوچھا "بیٹے! چوٹ تو

نہیں آئی ہے؟"۔ یہ کپڑے جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میاں صاجزادے! کیا پڑھتے ہو؟" پرنسپل صاحب نے شاید چوٹ بھلانے کو پوچھا۔

"معلّقات" (بارہ تیرہ سال کے بچّے سے ایسی موٹی، ایسی مشکل کتاب کا نام سُن کے پرنسپل صاحب اچھل نہ پڑے ہوں گے! سوچا ہوگا کہیں سے نام سُن لیا ہے یا اوّل نمبر کا جھوٹا ہے)

"کیا کہا؟ معلّقات؟"

"جی ہاں، معلّقات"

"بھئی کے برس کے ہو؟"

"مجھے کیا معلوم ہے؟"

پرنسپل صاحب نے سوچا ہوگا آج دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے۔ اُن کا ہاتھ پکڑ کے مفتی صاحب کے سامنے لے گئے۔

"مفتی صاحب! یہ لڑکا کہتا ہے میں معلّقات پڑھتا ہوں۔ ذرا دیکھیے تو سچ کہتا ہے یا باتیں بناتا ہے"

"تو کیا پڑھتا ہے؟" مفتی صاحب نے اپنی تیز آواز میں پوچھا۔

"معلّقات"

"کہاں پڑھتا ہے؟"

"پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں"

"معلّقات دوں۔ پڑھے گا"

"جی ہاں۔ لائیے"

"یہاں سے پڑھ" مفتی صاحب نے معلّقات کھول کے آگے رکھ دی۔ انھوں نے فرفر پڑھ کے سنا دیا اور مطلب بھی بتا دیا۔ پوچھا "کالج میں پڑھے گا" انھوں نے حامی بھر لی لیکن مولوی صاحب سے ڈرے بھی مگر جب انگریز پرنسپل کا رقعہ ان کے نام پہنچا

تو اگلے ہی دن وہ خود نذیر احمد کو کالج پہنچا گئے۔ یہ کالج ان کی ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ پڑھ لکھ کے خود مولوی صاحب بن گئے۔ اس لیے اب ہم انھیں مولوی صاحب کے نام سے ہی یاد کریں گے۔

غرض مولوی صاحب پڑھ چکے تو ملازمت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے تعلیمات کے انسپکٹر ہو گئے۔ اپنے بچّوں کو خود ہی پڑھاتے تھے۔ اُس زمانے میں آج کی طرح درسی کتابیں کہاں ہوتی تھیں۔ مولوی صاحب روز ایک دو صفحے لکھ کر بیٹے، میاں بشیر، کو دیتے اور ایک دو صفحے بیٹی کو۔ ہوتے ہوتے دو کتابیں تیار ہو گئیں ——— چند پند اور مراۃ العروس۔

سنا ہے حضرت موسیٰؑ آگ لینے گئے تھے تو پیغمبری مل گئی تھی۔ کچھ ایسا ہی واقعہ مولوی صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ ایک بار دورے پر نکلے۔ بال بچے ساتھ تھے۔ ایک جگہ کیمپ لگا۔ مسٹر کیمپ سن اُن دنوں ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ ان کا ڈیرا بھی سامنے ہی آن لگا۔ ایک دن صبح صبح ٹہلنے کے لیے نکلے تو میاں بشیر مل گئے۔ انھوں نے جھک کر سلام کیا تو انھوں نے نام پوچھا، باپ کا نام پوچھا۔ پھر پوچھا "پڑھتے کیا ہو؟" یہ بولے "چند پند" وہ حیران ہوئے کہ یہ نام تو سنا نہیں۔ کہا "ہمیں کتاب لا کے دکھاؤ"۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے کہا "آپا کی کتاب بھی لاؤں"۔ انھوں نے آپا کی کتاب کا نام معلوم کیا تو پتہ چلا "مراۃ العروس" یہ دوسرا نیا نام تھا۔ صاحب دونوں کتابیں ساتھ لے گئے اور اگلے دن مولوی صاحب کو سلام کہلا بھیجا۔

سنا تو یہ تھا کہ جس چیز کے پیچھے دوڑو وہ آگے آگے بھاگتی ہے اور جس چیز سے بھاگو تو وہ پیچھا کرتی ہے مگر مولوی صاحب کے معاملے میں تو یہ بات الٹی ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب کو پیسے سے بڑا پیار تھا اور پیسے کو مولوی صاحب سے۔ ہوا یہ کہ صاحب نے کتاب سرکار میں پیش کر دی اور وہاں سے اس پر انعام مل گیا۔ اب تو اللہ دے اور بندہ لے۔ مولوی صاحب نے ناولوں کی دکان لگا دی، ناولوں کے علاوہ اور کتابیں لکھیں۔ روپیہ بھی کمایا اور نام بھی۔ شمس العلما کا خطاب پایا۔ حیدر آباد میں اونچے

منصب پر پہنچے۔ ریٹائر ہوئے تو بھاری بھر کم پنشن ملی۔ جب پنشن کا روپیہ چاندی کے سکوں کی شکل میں آتا تھا تو اس کا چبوترہ بنا کر بچوں کو اس پر بٹھا دیتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ پھر اچانک یہ سوچ کر مغموم ہو جاتے تھے کہ خدا جانے میری اولاد میں کسی کو اتنی تنخواہ بھی ملے گی یا نہیں جتنی مجھے پنشن ملتی ہے۔ ان کے پوتے کے بیان کے مطابق یہ اندیشہ ابھی تک تو درست ہی ثابت ہوا ہے۔

اس سے پہلے آپ "قصۂ چار درویشوں کا"، "قصۂ حاتم طائی کا" اور "فسانۂ عجائب" پڑھ چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ سب داستانیں تھیں! ان میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر یقین نہیں آتا۔ ان داستانوں میں جو لوگ دکھائی دیتے ہیں وہ ہماری آپ کی طرح کے انسان نہیں۔ شہزادے شہزادیاں ہیں، پہنچے ہوئے فقیر ہیں یا پھر جن، بھوت اور پریاں ہیں۔

حاتم طائی کے قصے میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ کہانی سے کہانی نکلتی ہے۔ بات میں بات چھڑ جاتی ہے۔ یہ سب داستان کی خصوصیتیں ہیں۔ اب داستان کا دور ختم ہو گیا ہے اور ایسے قصے لکھے جانے لگے ہیں جو ہماری سچ مچ کی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ افرادِ قصہ یعنی ان میں دکھائی دینے والے لوگ جیتے جاگتے انسان ہیں بالکل ہمارے آپ کے جیسے جن میں دس خوبیاں ہیں تو دس کمزوریاں بھی ہیں۔ ان کے پاس نہ جادو کی چھڑی ہے نہ سلیمانی ٹوپی۔ ان کی ہار بھی ہوتی ہے اور جیت بھی۔ اس دنیا میں ہوتا بھی تو یہی ہے۔ ہے نا؟ دوسرے اب کہانی میں سے کہانی نہیں نکالی جاتی۔ خواہ مخواہ بات کو طول دینے سے کیا فائدہ۔ جو بات کہنی ہے اسے تسلسل کے ساتھ کہہ دیا۔

تو بھائی یہ ہوا ناول۔ اور کوئی مانے یا نہ مانے ہماری رائے میں تو مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں ـــــ اتنا تجربہ تو ہم سب ہی کو ہے کہ جب کوئی کام پہلے پہل کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ تو صاحب! مولوی صاحب کے ناولوں میں بھی ذرا بہت کمی ہے۔

دیکھنے میں تو یہ آتا ہے کہ کوئی آدمی نہ صرف خوبیوں کا پتلا ہوتا ہے نہ خرابیوں کا۔ دونوں چیزیں ملی جلی ہوتی ہیں۔ کوئی کم تو کوئی زیادہ۔ آدمی میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں تو آدمی نہ رہے فرشتہ ہو جائے۔ خرابیاں ہی خرابیاں ہوں تو بھی انسان نہ رہے شیطان ہو جائے۔ نذیر احمد کے کردار یا تو فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان۔ انسان کم ہی ہوتے ہیں۔ ظاہر دار بیگ کو دیکھیے تو بس دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ فریب ہی فریب ہے۔ ایک خوبی نہیں۔ نصوح، فہمیدہ، سیم سارے عیبوں سے پاک ہیں۔ پھر مولوی صاحب نے ایک مزے کی بات یہ کی کہ ہر کردار کا نام ایسا رکھا کہ نام سے سمجھ لو کہ وہ کیسا ہوگا۔ ظاہر دار بیگ ظاہر داری کے پتلے، زبردست بیگ کہ میاں کلیم لاکھ بھاگیں اس کے پنجے سے چھوٹ کے نہ جا سکیں، میاں نصوح جو ہر دم نصیحت کریں، صالحہ نیک بچی جو اوروں کو بھی نیک راستہ دکھائے۔

نذیر احمد کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ ناول نگار بعد کو ہیں اور مولوی صاحب پہلے۔ موقع ملا اور انھوں نے نصیحت کا دفتر کھولا۔ اس طرح کی کچھ کمزوریاں ان کے یہاں ضرور ہیں مگر وہ ہیں اردو کے پہلے ناول نگار۔

بس صاحب! ہمیں ناول اور ناول نگار کے بارے میں اتنی ہی باتیں کہنی تھیں۔ اب آپ شوق سے مولوی صاحب کا ناول پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔

۱

دہلی میں ایک بار ہیضے کی وبا اس زوروں سے پھیلی کہ گھر کے گھر اجڑ گئے۔ ایک ایک گلی کوچے سے دس دس جنازے ایک ساتھ نکلتے تھے۔ لوگ ہر طرح سے احتیاط کرتے تھے۔ جگہ جگہ سے دوا منگا کر رکھتے تھے۔ مگر سب بیکار۔ ان میں ایک نصوح بھی تھا۔ ہیضے کی جتنی دوائیں ہو سکتی تھیں اس نے سب منگا رکھی تھیں مگر جب ہیضے نے اس کے گھر کا رخ کیا تو سب دھری رہ گئیں۔ پہلے باپ اللہ کو پیارے ہوئے پھر خالہ دنیا سے سدھاریں۔ آخر میں موت نے ماما کو آدبوچا۔

خیر اللہ اللہ کر کے وبا کا زور کم ہوا۔ دلی والوں نے سکون کی سانس لی۔ ایک دن نصوح کا چاولوں کو جی چاہا۔ ہفتوں سے پرہیز کرتے کرتے جی اکتا گیا تھا۔ زردہ پکوایا اور خوب جی بھر کے کھایا۔ ابھی رات نہ بیتی تھی کہ اس موذی بیماری کا حملہ ہو گیا اور دن نکلتے نکلتے حالت غیر ہو گئی۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے دوا دی اور ہدایت کر دی کہ اسے اکیلا لٹا دیا جائے۔ نیند آ گئی تو سمجھو کہ بچ گیا ورنہ اللہ مالک ہے۔

نصوح کو اکیلے دالان میں لٹا دیا گیا۔ لوگ چپکے چپکے آتے اور دیکھ کر دبے پاؤں لوٹ جاتے۔ نصوح کا حال یہ تھا کہ بیماری زور پر

تھی مگر ہوش وحواس درست تھے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ذرا دیر کا دنیا میں مہمان ہے۔ آخری سفر کی تیاری ہے۔ یہ ایسی غشی ہے جس سے افاقہ ہونے والا نہیں۔ کبھی بیوی بچوں کا خیال رُلاتا، کبھی اس دنیا کا عیش وآرام یاد آتا۔ دو بیٹیاں تھیں جن کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ بڑا بیٹا تو یوں ہی ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ رہا منجھلا تو وہ اس سال انٹرنس کے امتحان میں شریک ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

رہ رہ کے یہ خیال ستاتا کہ اب گھر کی خیر خبر کون لے گا۔ پچھلے سال ایک گاؤں لیا تھا مگر اس پر ابھی پوری طرح قبضہ بھی نہ ہوا تھا۔ کھیت اور گودام پر روپیہ لگایا تھا اب وہ بھی ڈوبتا دکھائی دیتا تھا۔ مکان کی مرمت کا ارادہ تھا وہ بھی پورا نہ ہوا۔ موت نے اس کی مہلت بھی نہ دی کہ لوگوں کا حساب کتاب ہی صاف کر دیتا۔ سارے بکھیڑے یوں ہی رہ گئے اور موت سر پہ آپہنچی۔ کاش دس بارہ برس اور جی لیتا۔ سب کام ٹھیک ہو جاتے پھر مرتا تو یہ بے چینی نہ ہوتی۔ پہلے نصوح یہ سوچا کرتا تھا کہ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو موت سے گھبراتے ہیں۔ کتنی ہی لمبی عمریں پالیں مگر دنیا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب اپنے اوپر آبنی تو پتہ چلا۔ بیوی بچوں کا غم الگ، دنیا کے دھن دولت کا لالچ الگ۔ ابھی سفر شروع نہیں ہوا اور پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔

نصوح نے سوچا اب جان تو بچتی نہیں پھر پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔ یہ سوچ کر ذرا دل کو تسلی ہوئی۔ اُدھر دوا نے اپنا اثر کیا۔ آنکھ لگ گئی۔ ذرا دیر پہلے جو خیالات دل میں تھے سب تصویروں کی طرح آنکھوں کے آگے پھرنے لگے۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک عالی شان عمارت سامنے ہے۔ نصوح خود بھی ڈپٹی مجسٹریٹ حاکم فوجداری رہ چکا تھا۔ اس لیے ایسا لگا کہ یہ ہائی کورٹ کی عمارت ہے۔ حاکم کچہری کا رعب

ہر ایک کے دل پر چھایا ہوا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہے۔ مگر سب چپ چاپ کھڑے ہیں۔ اتنی بڑی کچہری ہے مگر مختار اور وکیل کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ سفارش، رشوت اور لالچ کا یہاں موقع نہیں۔ اس عدالت کے فیصلے کی اپیل ممکن نہیں۔ روز کے مقدمے کا روز فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مجرم کو قائل کر دیا جاتا ہے، گنہگار اپنے منہ سے اپنے گناہ کا اقرار کرنے پر مجبور ہے۔ چشم دید گواہ پیش ہوتے ہیں بلکہ ملزم کے راز دار گواہی دیتے ہیں۔ پھر بھی کوئی حاکم کے رحم سے ناامید نہیں۔

کچہری کا خیال نصوح کو حوالات کی طرف لے گیا۔ دیکھا کہ ہر شخص الگ الگ بند ہے۔ جس مجرم کا جیسا جرم ہے ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک ہوتا ہے۔ ان میں ہزاروں اجنبی تھے لیکن جگہ جگہ شہر اور محلّے کے آدمی بھی نظر آئے مگر وہ مرچکے تھے۔ اب تو نصوح اور حیران ہوا کہ الٰہی یہ کون سا شہر ہے، یہ کس کی کچہری ہے، اتنے مجرم کہاں سے پکڑے ہوئے آئے ہیں، یہ میرے شہر کے لوگ کس جرم میں گرفتار ہیں، یہ کیسے مرے تھے کہ پھر زندہ ہیں اور اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔ اسی سوچ میں چلا جاتا تھا کہ ان حوالاتیوں میں سے اپنے والد بزرگوار نظر پڑے۔ پہلے تو سمجھا نظر غلطی کرتی ہے پھر غور سے دیکھا تو پہچانا کہ وہی ہیں۔ دوڑ کر قدموں میں گر پڑا اور پوچھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔

انھوں نے جواب دیا: میں اپنے گناہوں کی جواب دہی میں گرفتار ہوں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دنیا کی نیکیوں کا بدلہ اور گناہوں کی سزا ملتی ہے۔ اس عدالت کا حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ نصوح نے حیران ہو کر سوال کیا کہ آپ کی عمر تو نیک کاموں میں بسر ہوئی۔ آپ پر گناہوں کا الزام کیسا؟ انھوں نے کہا: ایک نہیں سیکڑوں ہزاروں

گناہ۔ دیکھو میرا نامۂ اعمال میرے گناہوں سے بھرا پڑا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دوں گا اور میری رہائی کس طرح ہو گی۔

نصوح نے اس طرح کا کاغذ ہر ایک کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اسے فردِ جرم سمجھا تھا۔ اب باپ کا نامۂ اعمال دیکھا تو تھرا اٹھا۔ کفر، شرک، نافرمانی، ناشکری، بغاوت، جھوٹ، بے ایمانی، غرور، مکاری، دغابازی، حسد، غرض کوئی الزام نہ تھا جو اس فہرست میں شامل نہ ہو۔ خود قانون کا ماہر رہا تھا اس لیے دیکھنے لگا کہ کون کون سی دفعہ لگی ہے مگر یہاں دفعات کے بجائے قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کا حوالہ تھا۔ گھبرا کر باپ سے پوچھا: کیا واقعی آپ نے یہ سب جرم کیے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا "ہاں سب"

بیٹا: کیا آپ حاکم کے سامنے اپنے جرموں کا اقرار کر چکے ہیں؟

باپ: انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ میرے خلاف ایسی گواہیاں موجود ہیں کہ انکار کروں بھی تو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بیٹا: آپ کے وہ دشمن کون ہیں جو اتنی مخالفت پر آمادہ ہیں؟

باپ: اوّل تو کِرَامًا کَاتِبِیْن اس بلا کے ہیں کہ ان سے میرا کوئی کام چھپا نہیں۔ ساری زندگی وہ میرا روزنامچہ لکھتے گئے۔ اب جو میں اس کو دیکھتا ہوں تو ایک ایک حرف درست ہے۔ حد یہ ہے کہ میرے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان سب میرے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ میں انھیں اپنا رازدار اور مددگار جانتا تھا مگر یہ سب جاسوس نکلے اور انھوں نے میرے سارے بھید کھول دیے۔

بیٹا: آپ کا کیا حال ہے؟

باپ: جب سے دنیا چھوٹی، قبر کی حوالات میں ہوں۔ تنہائی سے

جی گھبراتا ہے۔ انجام کی خبر نہیں۔ دن رات اسی فکر میں پڑا گھلتا ہوں کہ دیکھیے کیا ہو۔ حوالات میں جو تکلیف ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔ جیل خانے کے پاس سے ہوکر روز گزرنا پڑتا ہے۔ وہی دوزخ ہے۔ وہاں کی تکلیفیں دیکھ کر اور بھی ہوش اُڑے جاتے ہیں۔ کاش ہمیشہ کے لیے حوالات میں رہنے کا حکم ہی ہو جاتا۔

بیٹا : کیا ابھی آپ کا مقدمہ پیش نہیں ہوا؟

باپ : خدا نہ کرے کہ پیش ہو۔ جو دن حوالات میں گزر رہا ہے غنیمت ہے۔ جب سے یہاں آیا ہوں برابر اپنے اعمال نامے کو دیکھتا رہتا ہوں اور انجام سے ڈرتا رہتا ہوں۔ بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

بیٹا : کیا ہم لوگ کسی طرح آپ کے کام آسکتے ہیں؟

باپ : ہاں، عاجزی اور خلوص سے میرے لیے دعا کرو تو شاید مفید ہو۔ میرے ہمسائے میں ایک آدمی تھا۔ اس کی ابھی رہائی ہوئی ہے۔ اس کے بیوی بچے رو رو کر اس کے لیے دعا کرتے تھے۔ پرسوں اُسے بلا کر ارشاد فرمایا کہ دنیا میں تو نے جتنی برائیاں کیں اب وہ سب تجھ پر ظاہر ہو چکی ہیں۔ مگر ہمارے کئی بندے تیری معافی کے لیے ہمارے آگے گڑگڑاتے ہیں۔ ہم کو تیری یہی ایک بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ تو نے اپنے خاندان میں نیکی اور دین داری کا بیج بویا۔ جا ہم نے تیری خطا معاف کی۔ بیٹا! سچ کہنا کبھی تم لوگوں نے بھی میرے لیے دعا کی؟

بیٹا : جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت ہوا بلکہ

آج تک ہوتا ہے اور یہ رونا تو ہمارے دم کے ساتھ ہے۔ جب تک جئیں گے آپ کی شفقتیں یاد کریں گے۔ دنیا کی رسم کے مطابق برادری میں کھانا بھی تقسیم کیا۔ سب ہی نے اس کی تعریف کی۔ دعا کا معاملہ یہ ہے کہ اس طرف توجہ نہیں کر پائے۔ آپ کے بعد جائیداد کے بٹوارے کے ایسے جھگڑے پڑے کہ آج تک نہ سلجھے ہاں یہ تو فرمائیے کہ آپ تو روزے نماز کے بڑے پابند تھے۔ کیا یہ بھی کام نہ آئے؟

باپ : کام کیوں نہ آئے۔ اُسی کی وجہ سے تم مجھے اس حالت میں دیکھتے ہو۔ ورنہ کتنوں کی حالت مجھ سے بدتر ہے۔ حوالات میں جیل خانے کی سی تکلیف ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اچھا فعل وہ ہے جس میں نیک نیتی اور خلوص شامل ہو۔ یہاں آکر دیکھا تو میرے اعمال ایسے تھے جیسے جھوٹے موتی اور کھوٹے سکے۔ نمازیں یوں بیکار گئیں کہ جی لگاکر نہ پڑھی تھیں۔ روزے رسم کی پابندی کے طور پر رکھے گئے تھے اس لیے فاقوں میں شمار ہوئے۔ مجھ سے سوال کیا گیا "تیرا رب کون ہے؟" میں نے جواب دیا "اللہ جس کا کوئی شریک نہیں۔" پھر پوچھا گیا "یہ بتا جب تیری دکن کی نوکری چھوٹ گئی تھی تو تجھے اللہ پر زیادہ بھروسہ تھا یا انگریز حاکم پر" میں نے شرم سے سر جھکا لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا "ہم نے تجھ پر ہزاروں احسان کیے مگر تو نے سب کو بھلا دیا۔ ہم نے جتنی تیرے ساتھ رعایت کی اتنا ہی تو گستاخ ہوتا گیا۔ چار دن کی زندگی پر تجھے اتنا گھمنڈ تھا کہ اپنے انجام کو بھول گیا تھا۔ ہم نے تجھے سب کچھ دیا مگر تو نے شکر ادا نہ کیا۔

کھاتا تھا اور انکار کرتا تھا، لیتا تھا اور بھول جاتا تھا۔ چہرے پر آنکھیں تھیں مگر اندھا تھا۔ ایک چھوڑ دو دو کان تھے مگر بہرا۔ ہم نے یہاں سے چلتے وقت تجھ سے کہا تھا کہ دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر۔ تو وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آکر جاگا۔

"نماز پڑھنے کھڑا ہوتا تو دنیا کی ساری بھولی بسری باتیں اسی وقت یاد آتیں اور تو نماز کیا پڑھتا تھا گھاس کاٹتا تھا۔ ہم نے تجھے روزے رکھنے کا حکم دیا تاکہ تجھے ہماری نعمتوں کی قدر ہو۔ مزاج میں انکسار پیدا ہو مگر تجھے بھوک پیاس کی شکایت کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ہم نے ہر چند چاہا کہ تو ہوش میں آجائے۔ تجھ کو سوتا دیکھ کر بہتیرا جھنجھوڑا۔ بہتیرے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے، کئی بار اٹھا اٹھا کر بٹھا دیا مگر تیرے نصیب کچھ ایسے سوئے ہوئے تھے کہ تو نے کروٹ تک نہ لی :-

تمامی عمر تو غفلت میں سویا ہمارا کیا گیا اپنا ہی کھویا
اب تو بہت نادم ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے"

اس وقت سے اب تک اسی سوچ میں ہوں کہ اب کیا ہو۔

2

باپ نے جو یہ اپنی رام کہانی سنائی تو بیٹے پر ایسی ہیبت چھائی کہ گھبرا کے آنکھ کھل گئی۔ جاگا تو وہی دالان تھا اور وہی تیمار دار۔ بی بی پاس بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی۔ سارے گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ رت جگے کے ارادے ہو رہے تھے مگر نصوح اور ہی اُدھیڑ بُن میں تھا۔ باپ کا انجام اس کی آنکھوں کے آگے تھا۔ اُن کی زندگی تو نیکیوں سے بھری ہوئی تھی تب یہ حشر ہوا۔ اب نصوح اپنی زندگی پر نظر ڈالتا تھا تو وہ عیبوں سے بھری دکھائی دیتی تھی۔ اتنے گناہ کیے تھے کہ ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔

آج اس نے طے کر لیا تھا کہ باقی زندگی نیک کاموں میں بسر کرے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ بیوی بچّوں کا کیا ہوگا۔ وہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بیوی سے تو امید ہے کہ میری بات مانے گی مگر بڑی بیٹی اور بڑا بیٹا بیاہے ہوئے ہیں۔ وہ میری بات کیا سنیں گے۔ منجھلی بیٹی بھی سیانی ہو گئی۔ چھوٹے بچّے البتہ سنبھل سکتے ہیں۔

نصوح نے سب سے پہلے اپنی بیوی فہمیدہ کو اپنے خواب کا حال سنایا۔ اِسے سُن کر اس پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ہچکی بندھ گئی۔ وہ بھی اپنے گناہوں کو یاد کر کے بہت روئی۔ نصوح نے ڈھارس بندھائی کہ جو ہُوا سو ہُوا۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا

کفر ہے۔ پچھلے گناہوں کے لیے توبہ کرنی چاہیے اور آئندہ ایسی زندگی گزارنی چاہیے جس سے وہ راضی رہے۔ اسی وقت دونوں نے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی چاہی اور آگے کو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا عہد کیا۔ اس کے بعد فہمیدہ کے دل سے توبوجھ سا اُتر گیا اور وہ خوشی خوشی بات چیت کرنے لگی لیکن نصوح چپ چاپ سا تھا۔ فہمیدہ نے پوچھا "جب یہ بات طے ہے کہ توبہ کرنے سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں تو تم اُداس کیوں ہو؟"

نصوح: خدائے تعالیٰ رحیم و کریم ہے۔ ہم آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کر سکتے ہیں۔ پچھلے گناہوں کی معافی چاہ سکتے ہیں۔ وہ ہماری توبہ کو قبول کرلے تو یہ اس کی عنایت ہے۔ انسان خطاؤں کا پُتلا ہے۔ غفلت اس کا مزاج ہے اور نافرمانی اس کی عادت۔ خدا ہی توفیق دے تو وہ اپنے وعدے کو نبھا سکتا ہے ورنہ آدمی سے کیا ہو سکتا ہے:

ہم کیا ہیں کوئی کام جو ہم سے ہوگا ۔۔۔ کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا ۔۔۔ جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے

ایک اور وجہ بھی ہے کہ میری اُداسی نہیں جاتی اور میرے دل کو چین نہیں ملتا۔

فہمیدہ: وہ کیا؟

نصوح: ایک غم اس بات کا ہے کہ میں تو بگڑا ہی تھا مگر میں نے ان بچوں کو کیسا برباد کیا۔ میری دیکھا دیکھی یہ بھی غلط راستے پر چل نکلے۔ دیکھتی نہیں چھوٹے بڑے سب ایک رنگ میں رنگ گئے۔ دین سے کسی کو لگاؤ نہ رہا۔ ان بیچاروں کا بھی کیا قصور۔ گھر میں اس کا کوئی چرچا ہی نہ تھا۔ نہ کوئی ایسا تھا

جو انھیں سمجھائے اور اچھے بُرے کا فرق بتائے ۔ بلکہ میرا تو یہ حال رہا کہ میں برابر ان کی تباہی اور بربادی میں مدد کرتا رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ہی ان کے حق میں کانٹے بوئے۔ ان سے دشمنی کرتا رہا اور سمجھا کہ ان کے لیے بھلائی کر رہا ہوں ۔ ان کی جتنی بُری عادتیں ہیں ان کا ذمّے دار میں ہی ہوں ۔ میں نے ان کا جی بہلانے کے لیے کھلونے اور کنکوّے دیے ، چھچھورے پن کی عادت ڈلوائی ، میلے تماشے کا شوق دلایا۔ مجھے یہ توفیق کبھی نہ ہوئی کہ صحیح طریقے سے ان کی پرورش کرسکتا۔ میں اس لایق نہ تھا کہ مجھے اس بھرے پُرے کنبے کی سرداری ملے ۔

اب سب کا حال یہ ہے کہ ایک سے ایک خراب ۔ ایک سے ایک بدتر ۔ ایک بدتمیز کو دیکھو کہ وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھا ہی رہتا ہے۔ کبھی سینے پر نظر ہے ۔ کبھی بازووں پر نگاہ ہے۔ آدمی کا بچّہ ہوکر لقا کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے ۔ اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدّی میں جا لگی ہے۔ کپڑے ایسے تنگ پہنتا ہے گویا کسی نے بدن میں سی دیے ہیں ۔ دوسرے کو دیکھو کہ صبح کو اٹھا اور کبوتر کھول باپ دادے کا نام اچھالنے کو کوٹھے پر چڑھ گیا، اور دن چڑھے تک دھما چوکڑی مچائی ۔ پھر ڈانٹ ڈپٹ کر اسکول بھیجا جب لوٹا تو کنکوّے بازی شروع کردی ۔ شام ہوئی تو شطرنج کی بازی جم گئی ۔ اتوار کو چھٹی ملی تو بٹیریں لڑائیں ۔ تیسرا سب سے نالایق ۔ بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ ! اس کی شرارتوں سے محلّے والے عاجز ۔ اِس کو مارا اُس کو چھیڑا ۔ غرض سب ایک سے ہیں۔

سب کے طور طریقے بُرے، زبان گندی، گالی بکنے میں شرم نہیں
بات بات میں زبان پر قسم۔
رہیں لڑکیاں تو دین سے انھیں بھی واسطہ نہیں۔ جب
دیکھو گڑیوں میں لگی ہوئی ہیں۔ بات بات میں کوسنے دیتی اور
قسمیں کھاتی ہیں۔ بناؤ سنگار سے انھیں فرصت نہیں۔ مگر کہوں
تو کیا کہوں۔ قصور تو اپنا ہی ہے۔

فہمیدہ: قصور تمھارا نہیں میرا ہے۔ تم ٹھہرے باہر رہنے والے آدمی۔
کہاں ان کی دیکھ بھال کرتے۔ بچے یوں بھی ماؤں کو پیارے
لگتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ تم نے کسی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کی
اور میں اِن کی بے جا حمایت کو دوڑی۔ انھیں ڈبویا تو میں نے۔
یہ گناہ میری گردن پر ہے۔

نصوح: ٹھیک ہے تم نے بھی انھیں سُدھارنے کی کوشش نہیں کی۔
مگر میں باپ تھا۔ پرورش تمھارا کام تھا۔ تربیت اور تعلیم
مجھ پر فرض تھی۔

فہمیدہ: ہاں میں نے ان کے جسم کو پالا مگر ان کی روح کو خراب
کیا۔ میری بے جا محبت نے ان کی عادتوں کو بگاڑا۔ میرے
لاڈ پیار نے ان کی برائیوں میں اضافہ کیا۔

نصوح: اگر میں اپنا فرض ایمان داری سے انجام دیتا اور انھیں
سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کرتا تو ممکن نہیں تھا کہ
میں کہوں اور یہ نہ سنیں۔ میں چاہوں اور یہ نہ کریں آخر
میرا ان پر، تم پر اور سب پر اختیار تھا۔

فہمیدہ: تم صحیح کہتے ہو مگر میں ہر وقت گھر میں رہتی تھی ان کے سارے
عیب مجھے معلوم تھے۔ تم تو ان کے پورے حالات سے بے خبر ہو۔

نصوح: پھر اب کیا ہو؟
فہمیدہ: میرے خیال سے تو اب ان کی اصلاح ممکن نہیں۔
نصوح: یہ تو نہ کہو کہ ممکن نہیں مگر اتنا ہے کہ مشکل ضرور ہے۔
فہمیدہ: میں تو یہی سمجھتی ہوں کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں۔ دیکھتے نہیں کلیم ایک ایک بات کے سو سو جواب دیتا ہے۔ اور کلیم ہی کیا۔ سب کا ایک حال ہے۔ جتنے بڑے اتنے کڑے۔ جتنے چھوٹے اتنے کھوٹے۔
نصوح: پھر کیا کریں۔ انھیں گمراہ ہونے دیں۔ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں کہ پیٹ بھر کے خراب ہوں۔
فہمیدہ: بوڑھے طوطوں کو پڑھانا، پکّی لکڑی کو لچکانا تمھارے بس میں ہو تو ضرور کرو۔ میں روکتی نہیں۔ مگر میں ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جو مجھ سے نہ ہو سکے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ بیٹوں کی نظر میں میری کتنی عزّت ہے۔ بیٹیاں میرا کتنا ادب کرتی ہیں۔ میں ماں ضرور ہوں مگر میری کوئی نہیں سنتا۔ کوئی میرے بس میں نہیں۔
نصوح: ابھی تم خود قبول کرتی تھیں کہ ان کی ساری برائیوں کی ذمہ دار تم ہو۔ اس لیے تم پر فرض ہے کہ ان کی اصلاح کی کوشش کرو۔ نتیجہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ سوچو کہ تم اپنی اولاد کو مصیبت میں دیکھو اور اس سے انھیں نکالنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ سوچ کر کہ یہ مصیبت ان پر بہت دنوں سے ہے۔ کیا مدّت کے بیمار کو دوا نہیں دیتے۔ پرانے ناسور کا علاج نہیں کرتے۔
فہمیدہ: میں یہ نہیں کہتی کہ کوشش نہ کی جائے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ ان بچّوں کے سنورنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

نصوح: تیرا ایسا ہی سہی مگر ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ ممکن ہے یہ کوشش ہی ہماری نجات کا سبب بن جائے۔

فہمیدہ: تم کوشش کر دیکھو۔ تمھارا ان پر کچھ رعب داب بھی ہے۔ میری بات اور ہے۔ میرے ساتھ تو سب گستاخ ہیں۔ لڑکیاں تو خیر مجھ کو برابر کی سہیلی سمجھتی ہیں۔ بیٹے تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ کیا بلا ہے اور کیا لگتی ہے۔ تمھیں ان بچوں کا صحیح حال معلوم نہیں۔ میں ان کے رگ و ریشے سے واقف ہوں۔

نصوح: ان سب باتوں کا یہ مطلب ہوا کہ تم ان کی اصلاح کو ناممکن خیال کرتی ہو؟

فہمیدہ: میں نے ناممکن کب کہا۔ ہاں یہ کام بہت مشکل ضرور ہے۔

نصوح: دشوار ہی سہی مگر یہ کام کرنا ہے ضرور۔ اب یہ سوچو کہ اس کا طریقہ کیا ہو۔ کیا انھیں سیدھے راستے پر لانے کے لیے سختی کرنی پڑے گی۔

فہمیدہ: ممکن ہے ایسا بھی کرنا پڑے۔ مگر جوتی لات سے کام لو گے تو ساری دنیا تھڑی تھڑی کرے گی۔ دوسرے یہ کہ سختی سے بچوں کے دلوں میں اور زیادہ ضد اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔

نصوح: دنیا کے بُرا بھلا کہنے کی تو میں پرواہ کرتا نہیں۔ سختی سے کام بنتے دیکھتا تو وہ بھی کرتا۔ مگر بڑے، بچے سختی کیوں برداشت کرنے لگے۔ ان پر اس کا الٹا اثر ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خطا تو میری ہے کہ ان کو بگاڑا اور سزا ان کو دوں۔

فہمیدہ: پھر تو یہ سنبھل چکے۔ نرمی سے کام چلے گا نہیں۔ سختی سے تم کام لینا نہیں چاہتے۔ مطلب یہ ہوا کہ اب کوئی امید نہیں۔

نصوح: یہ بات نہیں۔ میں تو دونوں ہی سے کام لوں گا۔ سختی کی جگہ

سختی سے اور نرمی کی جگہ نرمی سے ۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس طرح
میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گا۔ آخر آدمی کے بچے ہیں۔
بات کو سمجھتے ہیں۔ عقل رکھتے ہیں ۔ جب ان ہی کے فائدے
کی بات میں ان سے کہوں گا تو کیوں نہ سمجھیں گے ۔ سختی تو
بس اتنی کروں گا کہ ایک بات صاف کر دوں گا۔ وہ یہ کہ ۔جو
میرے کہنے کا نہیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ۔ مگر تمھاری
مدد کے بغیر یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا ۔

فہمیدہ: میں دل و جان سے مدد کرنے کو موجود ہوں ۔ میں جانتی ہوں کہ
تم جو کچھ کرنے کا ارادہ کر رہے ہو وہ انہی کی بہتری کے واسطے
کر رہے ہو ۔ اگر میں ان کی بھلائی نہ چاہوں تو میں ان کی ماں
کاہے کو ہوئی ، دشمن ہوئی ۔

نصوح: اگر اس کام میں تم برابر کی شریک ہو تو پھر مجھے کوئی غم نہیں ۔ تم
ساتھ دو گی تو مشکل آسان ہو جائے گی ۔ میں نے پڑھنے لکھنے
کے معاملے میں جب بھی کسی بچے پر سختی کی وہ اس وقت تک
کار آمد نہیں ہوئی جب تک تم نے میرا ساتھ نہیں دیا ۔

فہمیدہ: اب وہ بات نہیں ۔ جب تک یہ چھوٹے تھے ۔ مجھ کو ماں سمجھتے
تھے ۔ اب ہر ایک اپنے دل کا بادشاہ ہے ۔ لڑکوں سے تو
ہفتوں بات کرنے کی نوبت نہیں آتی ۔ بچیاں ہر وقت گھر ہی
میں بیٹھی کھیلا کرتی ہیں ۔ خیر مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا ضرور
کروں گی ۔

نصوح: بھلا چھوٹے بچوں کو تو سنبھال لو گی ؟

فہمیدہ: وہ تو موم کی ناک ہیں ۔ جدھر چاہو موڑ لو ۔ ان کا سنبھالنا
کیا مشکل ہے ۔ بلکہ ان سے تو منہ سے کہنا بھی نہیں پڑتا ۔ جیسا

بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں خود بھی ویسا ہی کرنے لگتے ہیں۔
ابھی ذرا دیر ہوئی کہ حمیدہ نے مجھے رُلا رُلا دیا۔ چھ برس کی عمر ہوتی ہی کیا ہے مگر دماغ سے اُتار کر بوڑھوں کی سی باتیں کرتی ہے۔

نصوح: کیا ہوا؟

3

فہمیدہ: تمھیں کچھ دنوں سے نماز پڑھتے دیکھتی ہے تو حیران ہوتی ہے۔ پرسوں مجھ سے پوچھنے لگی کہ "امّاں جان! ابّا جان دن میں کئی دفعہ ہاتھ منہ دھوکر یہ کیا کرتے ہیں؟ پہلے ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے جاتے ہیں پھر جھک جاتے ہیں۔ پھر منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "بیٹی! تمھارے ابّا جان نماز پڑھتے ہیں"
وہ بیچاری کیا جانے نماز کس کو کہتے ہیں۔ کبھی کسی کو نماز پڑھتے دیکھا ہو تو سمجھے۔ پوچھنے لگی "نماز کیا ہوتی ہے؟" مجھے اُس کے اس سوال پر بڑی شرم آئی۔ یہ پہلی چٹکی تھی جو اس نے میرے دل میں لی۔
میں نے اسے سمجھانا چاہا کہ خدا کی عبادت کو نماز کہتے ہیں۔

مگر یہ بات تو وہ جب سمجھتی کہ خدا اور اس کی عبادت کا نام سنا ہوتا۔ اس نے بڑے بھولے پن سے پوچھا کہ خدا کیا چیز ہے؟ اس سوال سے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے کہا "کیوں بیٹی! کیا تم خدا کو نہیں جانتیں؟" اس نے کہا "میں سب کو خدا کی قسم کھاتے سنتی ہوں۔ جب آپ کسی پر ناراض ہوتی ہیں تو کہتی ہیں تجھ پر خدا کی مار، تجھے خدا سمجھے۔ شاید خدا بیچا کو کہتے ہیں۔ مگر بیچا کو کہتے تو اس کی قسم نہ کھاتے۔"

میں نے کہا "حمیدہ توبہ کرو۔ توبہ۔ خدا بیچا نہیں ہے۔ خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی کھانے کو دیتا ہے۔ اسی نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ وہی ہم کو پالتا ہے۔"

"کھانا تو روز ہمارے گھر پکتا ہے۔ خدا کیا دیتا ہے؟" حمیدہ نے بھولے پن سے سوال کیا۔ میں نے سمجھایا "اللہ میاں پانی برساتے ہیں۔ زمین کو اناج، پھل ترکاریاں اگانے کا حکم دیتے ہیں؟" اس نے پوچھا "ہم ان کے کون ہیں جو وہ ہمارے لیے یہ سب کرتے ہیں؟" "ہم سب ان کے لونڈی اور غلام ہیں" میں نے جواب دیا۔

"لیکن لونڈی اور غلام تو خدمت کرتے ہیں۔ ہم کیا کرتے ہیں؟" اس نے فوراً پوچھا۔ "ہم سب کو ان کی عبادت کرنی چاہیے۔ جیسے تمھارے آبا جان کرتے ہیں" میں نے جواب دیا۔ اس نے کہا "اگر یہ بات ہے تو سب ہی کو نماز پڑھنی چاہیے۔ یوں کہ اس نے سب ہی کو تو پیدا کیا اور سب کو ہی پالتا ہے۔ تم نماز کیوں نہیں پڑھتیں اور میں کیوں نہیں پڑھتی۔"

میں نے کہا "میں تو بُرا کرتی تھی کہ اب تک نماز نہیں پڑھتی تھی۔ اب ضرور پڑھا کروں گی۔ اور تم ابھی بچی ہو۔ جب بڑی ہو جاؤ گی تو

پڑھنے لگوگی۔" پھر حمیدہ پوچھنے لگی "یہ ابا جان چپکے چپکے کیا باتیں کرتے ہیں؟" میں نے کہا "خدا کی تعریف کرتے ہیں۔ اس نے جو کچھ دیا اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کے لیے توبہ کرتے ہیں۔"

"امّاں جان! سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

"اس کی یہ باتیں سُن کر مجھے بڑی شرم آئی۔ مجھ سے زیادہ سمجھدار تو ماشاءاللہ یہ سات سال کی بچّی ہی ہے۔" فہمیدہ نے کہا۔

نصوح نے بھی اقرار کیا اور بولا "بسم اللہ تو اچھی ہوئی۔ اللہ ہماری مدد کرے گا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ کام کس طرح شروع کریں۔ میرا خیال ہے لڑکیوں کو تم سنبھالو۔ لڑکوں کو میں دیکھتا ہوں۔ مگر ہونا یہ چاہیے کہ دونوں ساتھ کام شروع کریں۔ بچے ہر وقت ایک ہی بات سنیں گے تو ان پر اثر ہوگا۔"

فہمیدہ نے ہر طرح نصوح کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

4

جس دن نصوح اور فہمیدہ میں یہ گفتگو ہوئی اس کے اگلے دن سلیم سو ہی رہا تھا کہ نصوح نے اس کو بلوایا۔ اس وقت سلیم کی عمر کوئی دس سال کی تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

حیران تھا کہ صبح ہی صبح کیوں بلوایا گیا ہے۔ ماں کے پاس جاکر پوچھا کہ "ابا جان نے کیوں بلایا ہے؟" انھوں نے کہا "مجھے تو کچھ معلوم نہیں" سلیم چاہتا تھا کہ ماں بھی اس کے ساتھ جائے مگر ماں نے تسلی دی اور کہا تم خود ہی چلے جاؤ اور دیکھو کہ کیا کہتے ہیں۔

سلیم ڈرتا ڈرتا اوپر گیا اور سلام کرکے ادب سے کھڑا ہوگیا۔ باپ نے پیار سے بلاکر پاس بٹھایا اور پوچھا "کیوں بیٹا ابھی اسکول نہیں گئے؟"

بیٹا : تھوڑی دیر میں جاؤں گا۔ اسکول شروع ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔

باپ : تم اکیلے اسکول جاتے ہو یا اپنے بھائی کے ساتھ۔

بیٹا : بھائی جان کے ساتھ تو کبھی کبھار چلا جاتا ہوں ورنہ اکیلا ہی جاتا ہوں۔

باپ : آخر یہ کیوں؟

بیٹا : اگلے مہینے بھائی جان کا امتحان ہونے والا ہے۔ وہ صبح ہی اپنے کسی ساتھی کے گھر چلے جاتے ہیں اور وہاں تیاری کرتے ہیں۔ اور وہاں سے اسکول پہنچ جاتے ہیں۔

باپ : یہ کیا بات ہوئی کہ پڑھنے کے لیے دوسروں کے گھر جاتے ہیں؟

بیٹا : جگہ تو بہت ہے مگر بڑے بھائی جان کے پاس ہر وقت شطرنج جمی رہتی ہے، شور ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے پڑھنا ممکن نہیں۔

باپ : شطرنج سے تو تمھیں بھی دلچسپی ہے۔

بیٹا : کھیل کود سے مجھے دلچسپی تھی مگر اب نہیں رہی۔

باپ : اس کی کیا وجہ ہے؟

بیٹا : ابا جان! آپ نے گلی میں چار لڑکوں کو آتے جاتے دیکھا ہوگا

باپ : وہی تو نہیں جو سیدھے سادے کپڑے پہنے، کتابیں لیے آیا جایا کرتے ہیں۔

بیٹا : جی ہاں وہی۔ وہ لڑکے پڑھنے لکھنے میں بہت اچھے ہیں۔ میری ان سے دوستی ہوگئی۔ ان کے گھر آنے جانے لگا۔ منجھلا بھائی میرا ہم جماعت تھا۔ وہ پڑھائی میں میری مدد کرنے لگا۔

ایک دن میں گھر کے اندر چلا گیا۔ ان کی نانی جنھیں حضرت بی کہتے ہیں تخت پر جائے نماز بچھائے بیٹھی تھیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو کہا "بیٹا گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا۔ لیکن میں تم کو دعا دوں گی۔ جیتے رہو لمبی عمر پاؤ۔ خدا نیک ہدایت دے۔" میں نے یہ سنا تو بہت شرمندہ ہوا۔ شاید وہ بھی یہ بات سمجھ گئیں۔ بولیں "بیٹا بُرا مت ماننا۔ یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے بڑے کو سلام کرتے ہیں۔ میں تمھیں نہ ٹوکتی لیکن تم میرے بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو۔ اس لیے جتانا ضروری ہوا۔"

اُس دن سے میں اُن کا بڑا ادب کرنے لگا۔ ایک دن ان کے دروازے کے سامنے میری ایک لڑکے سے لڑائی ہوئی۔ میں نے اسے خوب بُرا بھلا کہا۔ پھر اس نے زبان چلائی تو میں نے اس کی اچھی طرح مرمت کر دی۔ اُس دن حضرت بی نے مجھے بہت دیر تک بٹھا کر سمجھایا۔

باپ : کیا کہا انھوں نے ؟

بیٹا : انھوں نے کہا بُرے اور بدتمیز لڑکوں سے سلام دعا بھی نہ رکھنی چاہیے۔ اگر اس بدتمیز لڑکے سے تمھاری دوستی نہ ہوتی تو نہ گالی گلوج کی نوبت آتی نہ مار پیٹ کی۔ دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ سارا وقت کھیل کود میں برباد کرنا پڑھنے لکھنے والے

بچّوں کا کام نہیں۔ اپنا قیمتی وقت پڑھنے لکھنے میں لگاؤ تاکہ اوّل آؤ اور ترقی کرو۔ آخری بات انھوں نے یہ سمجھائی کہ حلیہ بھلے آدمیوں کا سا رکھو۔ یہ لمبے لمبے بال اور بے تکے کپڑے اچھے بچّوں کو بھلے نہیں لگتے۔ ہاں ایک ضروری بات، انھوں نے اور کہی کہ نماز پڑھا کرو۔

باپ : تو بٹیا ان باتوں کا تم پر کیا اثر ہوا ؟

بیٹا : میں نے بڑے لڑکوں سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔ کھیل کود سے مجھے خود بخود نفرت ہو گئی۔ اب میں زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں لگاتا ہوں۔ لیکن میں نہ تو بال کٹوا سکا اور نہ نماز شروع کر سکا۔

باپ : یہ کیوں ؟

بیٹا : میں نے بال کٹوانے چاہے تو بڑے بھائی جان نے مجھے بہت ڈانٹا کہ کیوں اپنی صورت بگاڑتا ہے۔ ایک دن میں نے نماز پڑھی تو انھوں نے طرح طرح سے اس کی ہنسی اڑائی۔ پھر میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔

باپ : تمھیں ڈرنا نہیں چاہیے تھا بلکہ اس بات کی مجھ سے شکایت کرنی چاہیے تھی۔

بیٹا : مجھے بڑے بھائی کی شکایت کرتے شرم آئی۔

باپ : خیر اب تم حضرت جی کی نصیحتوں پر پوری طرح عمل کرو۔ تم اپنے آپ کو ایسا نمونہ بناؤ کہ بڑے بھائی بھی تمھاری نقل کریں۔

5

اوپر تو باپ بیٹوں میں یہ بات چیت ہو رہی تھی۔ اتنی دیر میں نیچے فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔ نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینے کا بیٹا گود میں تھا۔ نازوں کی پلی تھی۔ نانی کی چہیتی۔ ماں کی لاڈو۔ مزاج پہلے ہی تیز تھا لاڈ پیار نے اور بگاڑ دیا۔ وہی کہاوت ہوئی کریلا اور نیم چڑھا۔ پھر ساس نندوں سے کیسے نبھتی۔ گھونگھٹ کے ساتھ ساتھ منہ بھی کھل گیا اور یہ ساس کا گھر چھوڑ کے چلی آئی۔ چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی تھی مگر رسی جل گئی بل نہ گیا۔ گھر اجاڑے بیٹھی تھی مگر دم خم وہی تھے۔ کنوارپنے میں سوگز کی زبان تھی مگر بڑی بوڑھیوں کا ذرا سا لحاظ تھا۔ بیاہ ہو گیا تو انھیں بھی دھتکار بتائی۔ بچہ ہوا تو بڑوں کا ذرا خیال نہ رہا۔

فہمیدہ نے میاں سے اقرار تو کر لیا تھا کہ اولاد کو درست کرنے میں مدد کرے گی مگر جب نعیمہ کا خیال آتا تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ جی میں کہتی ذرا میں نے اس بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ لگایا اور اس نے میرا سر مونڈا۔ بار بار ہمت کرتی مگر اس کا منہ دیکھتی تو ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔

فہمیدہ تو ارادہ کرتی ہی رہی مگر نعیمہ نے ایک دن خود اس کا موقع دیا کر بات صاف ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن صبح سویرے نعیمہ نے اپنا بچہ حمیدہ کی گود میں دیا اور خود ہاتھ منہ دھونے میں لگ گئی۔ نماز کا وقت نکلنے لگا تو بچے کو بٹھا کر نماز پڑھنے لگی۔ آخر بچہ تھا کس بدمزاج ماں کا۔ اس نے بلبلانا شروع کر دیا۔ بچے کی آواز سن کر نعیمہ دوڑی آئی۔ دیکھا کہ بچہ اکیلا پڑا رو رہا ہے اور حمیدہ نماز پڑھ رہی ہے۔ بس، پھر کیا تھا اس کا تو پارہ چڑھ گیا۔ حمیدہ کے ایک ایسی دو ہتڑ ماری کہ بیچاری اوندھے منہ جا کر گری اور ناک سے خون کی تلّی بہہ نکلی۔

ذرا دیر میں فہمیدہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ حمیدہ کو اس حالت میں دیکھا تو گھبرا گئی۔ پوچھا "ابھی تو میں تمھیں ٹھیک ٹھاک چھوڑ گئی تھی پل کے پل میں یہ کیا ہو گیا" حمیدہ بیچاری ابھی بول بھی نہ پائی تھی کہ نعیمہ خود بول اٹھی "اے بی! ہوا کیا ذرا کی ذرا لڑکے کو دے کر میں منہ دھونے چلی گئی۔ اس نکمی سے اتنا نہ ہو سکا کہ ذرا اسے لیے رہتی۔ آخر میں کہیں کنوئیں میں ڈوبنے تو نہیں چلی گئی تھی۔ اسے بلکتا چھوڑ نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ میں جو آئی تو ہولے سے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا آپ دھڑام سے گر پڑیں۔ کہیں تخت کی کیل چبھ چبھا گئی ہو گی۔"

ماں: خوب! تم نے ہولے سے ہاتھ رکھا اور اس کے خون کی ندی بہہ نکلی۔ ہائے دنیا میں کیسا خون سفید ہو گیا ہے۔

نعیمہ: ہاں خون سفید نہ ہو گئے ہوتے تو بھانجے کو یوں روتا بلکتا چھوڑ دیتی؟

ماں: تم خود سوچو۔ نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ بچے کو لٹا دیا تو کیا ہوا؟

نعیمہ : ایسی بھی کیا نماز ہوئی کہ اس کے آگے بھانجا بھی پیارا نہ ہوا۔ ایک وقت کی نماز نکل جاتی تو کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔

ماں : لڑکی خدا کے غضب سے ڈر۔ کیا کفر بک رہی ہے۔ رسّی جل گئی پر بل نہ گئے۔ اس حالت کو پہنچ گئی مگر سنبھلی اب تک نہیں۔

نعیمہ : خدا نہ کرے۔ میری کون سی بُری حالت تم نے دیکھی۔

ماں : خدا دشمن کی بھی یہ حالت نہ کرے کہ تین برس بیاہ کو ہو گئے اور ایک دن چین سے سسرال میں رہنا نصیب نہ ہوا۔

نعیمہ : جب میرے لیے ایسا جنم جلا گھر ڈھونڈا تو اس میں میرا کیا قصور۔

ماں : ہاں بیٹی ٹھیک کہتی ہے۔ میں تیری ایسی ہی دشمن تھی۔ مائیں اسی لیے تو بیٹیوں کو بیاہتی ہیں کہ وہ اپنے گھر کو اجاڑیں ان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہیں۔

نعیمہ : ہم کیا جانیں۔ ہمیں تو تم نے آنکھیں میچ کے کنوئیں میں دھکیل دیا تھا سو اب تک پڑے ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔

ماں : خیر بیٹی! اللہ رکھے تمھارے آگے بھی اولاد ہے۔ تم ان کا شادی بیاہ سوچ سمجھ کر کرنا۔

نعیمہ : ہاں ہاں کریں گے ہی اور کیا تمھارے بھروسے بیٹھے رہیں گے۔

ماں : میں کب کہتی ہوں کہ میرے بھروسے بیٹھی رہنا۔ آدمی بیچارے کا بھروسہ ہی کیا۔ بڑا بھروسہ اوپر والے کا۔

نعیمہ : اجی بھروسہ اپنے دم قدم کا۔

ماں : دیکھ نعیمہ! تو نے پھر وہی بدزبانی کی۔ اب اس طرح کی بات منہ سے نکالی تو میں تڑسے تیرے منہ پہ طمانچہ کھینچ ماروں گی۔

نعیمہ : سچ کہا۔ بڑی آئیں بیچاری مارنے والی۔ مارو اپنی چہیتی کو۔ مارو اپنی لاڈو کو۔

ماں : جو اولاد خدا کو نہ مانے وہ کس کام کی۔
نعیمہ : اچھا۔ یہ کب سے ؟
ماں : جب سے اللہ نے سیدھا راستہ دکھایا۔
نعیمہ : چلو خیر۔ جب ہم تمھاری عمر کو پہنچیں گے تو ہم بھی اللہ اللہ کرلیں گے۔
ماں : تم ایسی پہنچی ہوئی ہو کہ آنے والے زمانے کا حال معلوم ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ ہماری عمر تک ضرور پہنچو گی۔
نعیمہ : اب تم میرے مرنے کی فال نکالو۔
ماں : نہ کوئی کسی کی فال سے مرتا ہے نہ جیتا ہے۔ جس کی جتنی عمر خدا نے لکھ دی نہ اُس میں کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔
نعیمہ : ہاں ورنہ تم مجھے کاہے کو جینے دیتیں۔
ماں : اتنا اختیار ہوتا تو تجھے آدمی نہ بنا لیتی۔
نعیمہ : تو کیا میں حیوان ہوں ؟
ماں : جو خدا کو نہ مانے اور بڑوں کا ادب نہ کرے وہ انسان کیسے ہوگیا۔
نعیمہ : تمھارے لیے تو بس ایک حمیدہ انسان ہے۔ باقی سب گدھے ہیں۔
ماں : حمیدہ کا تجھے کیا جلاپا پڑ گیا۔ تو اس کی جوتی کی برابری تو کرلے۔
نعیمہ : خدا کی شان ! ذرا سی اُٹھک بیٹھک کرنے سے حمیدہ کو یہ بھاگ لگ گئے۔

فہمیدہ بہت دیر تک نعیمہ کو سمجھا چکی تھی۔ اس نے اب بھی زبان نہ روکی تو فہمیدہ کا غصہ قابو سے باہر ہوگیا اور اس نے تڑ سے ایک طمانچہ نعیمہ کے منہ پر کھینچ مارا۔ طمانچے کا لگنا تھا کہ اس نے آفت برپا کر دی۔ سب سے پہلے تو اس نے دے دھواں دھول اپنے بے زبان بچے کو پیٹ ڈالا۔ اگر لوگ بچے کو چھین نہ لیتے تو وہ اسے مار ہی ڈالتی۔ اس کے بعد تو اس نے کیسے کیسے فیل

مچائے۔ گھنٹوں زمین میں لوٹی۔ کپڑے پھاڑ ڈالے۔ سر پر سیکڑوں دوہتڑ مارے۔ دیواروں میں ٹکریں ماریں۔ اس کے یا کھنڈ دیکھ کر سارا گھر تھرّا اٹھا۔ بڑی مشکل سے پکڑ دھکڑ کے اسے کوٹھری کے اندر دھکیلا اور باہر سے کنڈی لگائی۔

نیچے گھر میں اتنا شور ہوا مگر اوپر نصوح کو پتہ بھی نہ چلا۔ فہمیدہ اوپر گئی تو اس کے چہرے سے غصّہ ٹپک رہا تھا۔ نصوح نے دور ہی سے پوچھا "خیر تو ہے" فہمیدہ نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ قصّہ سُن کر نصوح بھی سنّاٹے میں آگیا۔ تھوڑی دیر دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آخر فہمیدہ نے پوچھا "پھر اب کیا صلاح ہے؟"

نصوح: صلاح یہی ہے کہ اب نرمی نہیں برتنی چاہیے۔ اسی طرح اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں اس وقت وہاں موجود نہ تھا ورنہ اس سے بھی سخت سزا دیتا۔ ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا اچھا۔ بس تو کہتا ہوں ڈولی منگواؤ اور اس کو ابھی سسرال بھجوا دو۔

فہمیدہ: بھلا کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایسے کس طرح سسرال بھیج دیں۔ اس نے پہلے ہی اپنی عزّت کو خاک میں ملا رکھا ہے۔ بن بلائے بھیج دیں گے تو رہی سہی عزّت بھی مٹی میں مل جائے گی۔ مجھے کیا خبر تھی ورنہ تمھاری عیادت کے لیے سارا سمدھیانا آیا تھا۔ سب اسے لے جانے کے لیے منتیں کرتے تھے۔

نصوح: مجھے اس کے طور طریقے ناپسند ہیں اور تمھاری رائے میں اسے سسرال بھیجنا مناسب نہیں۔

فہمیدہ: ہاں اس طرح سسرال بھیجنا تو اسے اجاڑنے کے برابر ہے۔

نصوح: تم دل کی ایسی کچی تھیں تو انھیں سدھارنے کا بیڑہ کیوں اٹھایا تھا؟

فہمیدہ: کیا اولاد کے لیے جی نہیں کڑھتا۔ میں نے اُسے اس دن کے لیے تو نہ پالا تھا کہ اپنے ہاتھوں اس کا گھر اجاڑ دوں۔

اتنا کہہ کر فہمیدہ کا جی بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

نصوح: کیا میں اس کا باپ نہیں۔ کیا میرے دل میں اس کی محبت نہیں۔ میں نے یہ کب کہا کہ اسے چھوڑ دو؟

فہمیدہ: کیوں، تم نے ابھی اسے سسرال بھیجنے کو نہیں کہا؟

نصوح: کیا سسرال بھیجنا اور چھوڑنا ایک ہی بات ہے؟

فہمیدہ: ہنسی خوشی جانا اور بات ہے۔ ایک دن دنیا جہان کی بیٹیاں سسرال جاتی ہیں۔ لڑ بھڑ کر جانا اور بات ہے۔ پھر لڑائی بھی ایسی کہ عمر بھر نہیں ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے نعیمہ کو کبھی ہاتھ بھی لگایا ہو۔ وہ ہمیشہ کی منہ چڑھی ہے۔ اس نے اس سے سخت جواب دیے۔ مگر اس نے جب بھی جواب دیا میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ اس بار میں کچھ ایسی آپے سے باہر ہوگئی کہ تھپڑ کھینچ مارا۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ بڑی بیاہی ہے۔ ماشاءاللہ اولاد والی ہے۔

نصوح: تم نے اُسے بے بات تو سزا دی نہیں جو اب پچھتاتی ہو۔ جو اپنے بڑوں کا لحاظ پاس نہ کرے اور اللہ سے نہ ڈرے اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔

فہمیدہ: تم ٹھیک ہی کہتے ہو چھاتی پر پتھر رکھنا ہی پڑے گا۔ اسی طرح یہ بچے سدھر سکتے ہیں۔

اتنا کہہ کر فہمیدہ کی ہچکی بندھ گئی۔ نصوح نے اُسے دلاسا دیا کہ

دل مضبوط رکھو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ انھیں نیک راستہ دکھائے۔

فہمیدہ: میرا تو رواں رواں دعا کر رہا ہے۔ اللہ قبول کرے۔ اسی سے لَو لگی ہے۔

نصوح: نعیمہ کوٹھری کے اندر کیا کر رہی تھی؟

فہمیدہ: رو رہی تھی اور کیا کرتی۔ میں چلتے ہوئے کہہ آئی تھی کہ کواڑ کھول کر اسے پانی وانی پلا دینا۔

نصوح: اور کھانا؟

فہمیدہ: خوب، نہ ابھی دو دن نہ چار دن۔ ابھی سے کھانا!

نصوح: یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے۔

فہمیدہ: اور کیا بڑا ارد!! تو کھانے ہی کا ہے۔ وہ مجھ سے چاہے مہینوں نہ بولتی مگر کھانا کھا لیتی تو کوئی فکر کی بات نہ تھی۔ اسے بھی تکلیف ہوگی اور بچہ بھی دودھ کو ترپے گا۔

نصوح: تم اپنا دودھ پلا دینا۔

فہمیدہ: میں تو اس کو سو دفعہ پلاؤں مگر اللہ رکھے سیانا بچّہ ہے۔ ماں کی گود پہچانتا ہے۔ کہتے ہیں چالیس دن کا بچہ ماں کی پرچھائیں دیکھنے لگتا ہے۔ اب سوتے کو ایک دفعہ میں پلا آئی ہوں۔ جاگتے میں پیے تو جانوں کہ پیا۔

نصوح: اسے کھانا کھلانے کی کچھ تدبیر کرنی چاہیے۔ میں جا کر کہوں؟

فہمیدہ: نہ۔ خدا کے لیے تم مت اترنا۔

نصوح: میں آہستگی سے سمجھا دوں گا۔

فہمیدہ: تم مَردوں کی آہستگی کا کیا اعتبار؟

نصوح: نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سختی نہ کروں گا۔

فہمیدہ : پھر بھی تمھارا دخل دینا مناسب نہیں۔ گھر میں ایک آدمی ایسا بھی ہونا چاہیے جس کا سب لحاظ کریں۔ اس وقت وہ غصّے میں ہے۔ اگر تمھارا کہا نہ مانا تو بڑی مشکل ہوگی اور پھراُ سے یہ شرم رہے گی کہ دیکھو کہ باپ تک مجھ کو سمجھا کر ہار گئے اور میں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ اب جو میں کھاؤں گی تو باپ جی میں کیا کہیں گے۔

نصوح : ایسا کرو۔ اس کی سہیلیوں میں سے کوئی سمجھدار ہو تو اس کو بلا بھیجو۔ وہ سمجھا بجھا کر راضی کرلے گی۔

فہمیدہ : ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں اپنی بھاجی صالحہ کو بلاتی ہوں۔ دونوں میں کافی دوستی ہے۔

نصوح : تم نے بہت اچھا انتخاب کیا۔ تمھاری بہن کے گھر کا ماحول بہت اچھا ہے۔ چھوٹے بڑوں کی عزّت کرتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ روزے نماز کا بھی چرچا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صالحہ بھی نیک لڑکی ہوگی۔

فہمیدہ : ہاں اس میں کیا شک ہے۔ صالحہ کیا سبھی نیک، خوش اخلاق، مہذب اور دیندار ہیں۔ میری بہن کو دیکھو۔ ان کے ساتھ کتنا بکھیڑا ہے مگر کسی وقت کی نماز چھوٹ تو جائے۔ تنگی ہو تو کوئی شکایت نہیں کرتا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہمیں اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے مگر تمھیں سچ بتاتی ہوں اگر کسی شادی بیاہ میں کسی کو اپنے سے اچھا اوڑھے پہنے دیکھ لوں تو میرا جی ضرور کڑھتا ہے۔ بچوں کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی چیز کسی کے پاس دیکھ پائیں تو جب تک ویسی ہی موجود نہ ہو جائے میری جان کھا جائیں۔ لیکن میری بہن پر اللہ کا یہ احسان ہے کہ وہ

کسی کی حرص نہیں کرتیں۔ ہمیں اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ ہماری کوئی چیز دیکھتی ہیں تو باغ باغ ہو جاتی ہیں۔

نصوح: سچ ہے تونگری دل سے ہوتی ہے مال سے نہیں۔ اور انسان سمجھے تو دنیا کے مال دولت کی حیثیت ہی کیا ہے۔ پھر اس پر کوئی کیوں حسد کرے۔

فہمیدہ: بچے بھی ماشاء اللہ ایسے ہی سمجھدار ہیں۔

نصوح: کوشش کیا کرو کہ کبھی کبھار تمھاری بہن دو چار دن کے لیے یہاں آکر رہ جایا کریں۔ ذرا ہمارے بچوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔

فہمیدہ: وہ بڑی غیرت والی ہیں۔ سمجھتی ہیں کہ ہم مدد کے طور پر انھیں بلانا چاہتے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرے ساتھ بکھیڑا بہت ہے۔ معلوم نہیں تمھاری سسرال والے کیا سوچیں اس لیے میرا آنا مناسب نہیں۔ تم بیٹوں بیٹیوں کی شادی کر دو۔ پھر دیکھو کہ بے بلائے پہنچتی ہوں کہ نہیں۔

نصوح: کاش کوئی ایسی صورت ہوتی کہ ان کی آرام سے بسر ہو جاتی۔

فہمیدہ: ہمارے بہنوئی اس کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں خدا جتنا دیتا ہے اس میں گزر بسر ہو جاتی ہے۔

نصوح: گھر میں خرچ کی تکلیف رہتی ہوگی؟

فہمیدہ: تکلیف کیسے نہ رہے گی۔ چھوٹی سی تنخواہ اور اتنا بڑا کنبہ۔ مگر وہ تو یہ کہو کہ چلن کے آدمی ہیں اس لیے ظاہر رکھ رکھاؤ بھی اچھا ہے۔ کبھی کسی نے ایک روپیہ ان کے گھر لگایا ہوگا تو انھوں نے دو لگائے ہوں گے۔ اس لیے کنبے برادری میں بھی کسی سے شرمندہ نہیں۔

نصوح: واقعی بڑی اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔

فہمیدہ : ہاں ۔ اس میں کیا شک ہے ۔ ہر بات میں اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔
نصوح : مجھے حیرت اس پر ہے کہ تم دونوں سگی بہنیں ہو اور تم دونوں کی عادتوں میں اتنا فرق ہے۔
فہمیدہ : ماں کے گھر تک تو میرا بھی یہی حال تھا۔ انھوں نے ہم دونوں کو ایک سا سکھایا۔ ایک سا پڑھایا مگر بُرا مت ماننا جب سے تم سے بیاہ کر آئی ہوں عادتیں ہی بدل گئیں۔ یہاں آکر روزہ نماز بھی چھوٹ گئی۔ پھر تو یہاں کے رنگ میں ایسی رنگی کہ پچھلی کوئی بات باقی ہی نہ رہی۔ اب اللہ نے چاہا تو پچھلی باتیں لوٹ آئیں گی۔ ارادہ تو یہی ہے۔ خدا پورا کرے۔
نصوح : آمین۔

اس کے بعد نیچے اتر کر فہمیدہ نے صالحہ کے لیے ڈولی بھیجی اور نوکرانیوں سے کہہ دیا کہ صالحہ آجائے تو چپکے سے مجھے خبر کر دینا۔

6

عصر کی نماز کے بعد نصوح نے اپنے منجھلے بیٹے علیم کو بلوایا ۔ معلوم ہوا کہ ابھی اسکول سے آئے ہیں اور کپڑے اتار رہے ہیں۔ نصوح نے کہلا بھیجا کہ ذرا دیر میں میرے پاس ہو جائیں۔ علیم نے کپڑے بدلے، کتابیں ٹھکانے سے رکھیں اور باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ باپ نے

کہا " آؤ بیٹا ! سنا ہے آج کل تمھیں بڑی محنت کرنی پڑ رہی ہے ۔

بیٹا : ششماہی امتحان شروع ہونے میں تھوڑے دن باقی ہیں ۔ اسی کے لیے تیاری کر رہا ہوں ۔

باپ : پھر تو رات کو دیر تک جاگتے اور تیاری کرتے ہوں گے ۔

بیٹا : رات کو تو پڑھ نہیں پاتا ۔ صبح کو اپنے کسی دوست کے گھر چلا جاتا ہوں اور وہاں کچھ دیر تیاری کر لیتا ہوں ۔

باپ : یہ کیا بات ہوئی کہ رات کو نہیں پڑھ پاتے ۔ پھر یہ کہ دن میں بھی اپنے گھر نہیں پڑھتے اور دوست کے یہاں جاتے ہو ۔

بیٹا : رات کو پڑھنے کی بہت کوشش کرتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ بھائی جان کے پاس اُن کے دوست آ بیٹھتے ہیں اور وہ دھاچوکڑی مچاتے ہیں کہ پڑھنا لکھنا ممکن نہیں ۔

باپ : پھر اس کا کچھ علاج نہیں کیا ۔

بیٹا : میں اس کا کیا علاج کر سکتا ہوں ۔ مجبوراً دوست کے گھر جا کر پڑھ لیتا ہوں ۔ اس کے سوا کر ہی کیا سکتا ہوں ۔

باپ یہ تو ششماہی امتحان کی بات ہوئی ۔ اب یہ بتاؤ کہ بڑے امتحان کے لیے بھی کچھ تیاری کر رہے ہو ؟

بیٹا : بڑے امتحان کے تو ابھی بہت دن پڑے ہیں ۔ اس وقت تو ششماہی امتحان کے لیے تیاری کر رہا ہوں ۔

باپ : کیا اس امتحان کے لیے کوئی وقت مقرر ہے ؟

بیٹا : جی ہاں ، وہ امتحان تو بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد ہوتا ہے ۔

باپ : تم سمجھے نہیں ۔ میرا مطلب اس امتحان سے ہے جس دن دنیا کے سارے کاموں کا حساب ہوگا ۔ بتاؤ اس کے لیے کیا تیاری کر رہے ہو ؟

بیٹا : جناب سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی۔
باپ : تم کافی ہوشیار ہو۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لیے پہلے سے تیاری کرتے ہو تو اس امتحان سے کیوں غافل ہو جو سب سے بڑا امتحان ہے۔
بیٹا : اس کے سوا کیا کہوں کہ یہ میری غفلت ہے۔
باپ : کیا غفلت کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔
بیٹا : ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھر میں اس کا کوئی چرچا نہیں۔
باپ : بالکل ٹھیک۔ یہی میرا خیال ہے۔ میں اسی لیے کُرید کُرید کر پوچھ رہا تھا۔ اصل میں سارا قصور میرا ہے کہ میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ گھر والوں کے سدھار کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں اپنی اس کوتاہی کا تمھارے سامنے اقرار کرنا چاہتا تھا۔
بیٹا : نہیں جناب اس میں قصور میرا ہی ہے۔ مجھے خدا نے عقل دی تھی۔ مجھے غور کرنا چاہیے تھا کہ جانوروں کی طرح کھانا پینا اور سو رہنا ہی تو سب کچھ نہیں۔
باپ : تم ماشاء اللہ کافی سمجھ دار ہو۔ بات چیت سے پتا چلتا ہے کہ دین کی باتوں کو بھی تھوڑا بہت سمجھتے ہو۔ نہ میں نے تمھیں بتائیں نہ تم نے مدرسے میں پڑھیں پھر یہ باتیں کہاں سے سیکھیں۔
بیٹا : اس میں شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا۔ لیکن وہ زبان میں سمجھتا نہیں۔ توتے کی طرح شروع سے آخر تک بلا سمجھے پڑھ گیا۔ اس میں کیا لکھا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ سب میری عقل سے باہر تھا۔ اسکول گیا تو وہاں بھی اس طرح کی کوئی کتاب نہ ملی۔ قصے کہانیوں کی کتابیں بہت تھیں۔ ان سے کیا معلوم

ہوتا ۔ ایک دن بازار سے گزرا۔ دیکھا کہ ایک پادری صاحب کھڑے وعظ کہہ رہے ہیں ۔ کافی مجمع ہو گیا تھا۔ ہندو مسلمان چاروں طرف سے ان پر سوالوں کی بوچھار کر رہے تھے اور وہ مُسکرا مُسکرا کر ہر ایک کو جواب دیتے تھے ۔ یوں لگتا تھا کہ سب مل کر انھیں زچ کرنا چاہتے ہیں ۔ اسی بھیڑ میں سے ایک لڑکا بولا "لؤ لؤ ہے لؤ لؤ" اس بدتمیزی پر تو چاروں طرف کھڑے لوگوں کو بھی غصّہ آیا ۔ سب اسے بُرا بھلا کہنے لگے ۔ دو ایک نے تو مارنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا مگر پادری صاحب نے منع کیا۔ کہنے لگے "لؤ لؤ کے معنی موتی کے بھی ہیں ۔ ممکن ہے اس کا یہی مطلب ہو" ان کے اس اخلاق کا لوگوں پر بڑا اثر ہوا ۔ سب نے ان کے برداشت کی بہت تعریف کی ۔ پادری صاحب بچوں کو پڑھنے کے لیے کتابیں دیا کرتے تھے ۔ میں نے بھی اُن سے ایک کتاب مانگی انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا پڑھتے ہو؟" میں نے جواب دیا "بہارِ دانش" کہنے لگے: آج کا سبق سناؤ۔ اور اس کا مطلب بتاؤ۔ میں نے سبق پڑھا اور مطلب بتایا۔ مگر وہ سبق کچھ ایسا گندہ تھا کہ مجھے بھی شرم آئی اور سننے والوں کو بھی ۔ پادری صاحب نے کہا" اب اس کتاب کو کبھی نہ پڑھنا۔ تمھارا مذہب بھی ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ جس کتاب میں بری اور گندی باتیں لکھی ہوں اس کے پڑھنے سے نہ پڑھنا اچھا۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجھے ایک کتاب دی ۔ اس کتاب میں کسی نیک آدمی کی زندگی کے حالات تھے ۔ میں نے اسے بڑی توجہ سے پڑھا۔ اس کی وجہ سے مجھے اس طرح کی کچھ باتیں معلوم ہو گئیں ۔

باپ : مسلمانوں اور عیسائیوں کے اعتقادات میں کچھ فرق ضرور ہے۔ پھر بھی جس قدر کہ عیسائیوں کا مذہب اسلام سے ملتا ہے اتنا کوئی اور نہیں ملتا۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور ان کے

بزرگوں کی تعریف آئی ہے۔ ان کی مذہبی کتاب انجیل بھی اللہ کا کلام ہے۔ دوسروں کی مدد اور ہمدردی کے لیے عیسائی مذہب میں جتنی تاکید ہے اس کا تمھیں شاید اس کتاب سے اندازہ ہوا ہوگا۔

بیٹا : جی ہاں اندازہ ہوا کہ خاکساری اور ہمدردی عیسائیت میں لازمی ہے۔

باپ : عیسائیت کے لیے کیا انسانیت کے لیے لازمی ہے :

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

لیکن یہ بتاؤ کہ تم اس پر عمل کہاں تک کرتے ہو؟

بیٹا : ایک بات تو یہ ہے کہ اگر اسکول کا کوئی لڑکا مجھ سے پڑھنے لکھنے میں کوئی مدد چاہے تو میں اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں چاہے اس میں میرا کچھ حرج ہی ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ میرے پاس جو کچھ ہو وہ ضرورت مند لوگوں پر خرچ کر دیتا ہوں۔ دوسروں کی مدد کے سلسلے میں تو ایک دفعہ میں پریشانی میں پھنس بھی گیا تھا۔

باپ : وہ کیا۔

بیٹا : عید کا دن تھا۔ میں خالہ جان کے گھر جا رہا تھا۔ امّاں جان نے گوٹے کی ایک بھاری ٹوپی مجھے بنا دی تھی وہ میرے سر پر تھی۔ یہاں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو دیکھا کہ بہت سے چپراسی اور پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ میں بھی اس بھیڑ میں جا گھسا۔ ایک بوڑھی عورت بچّوں کو لیے کھڑی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کے میاں کو پیادے پکڑے لیے جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے بنیے سے ادھار لیا تھا۔ اب

بنیے نے اس پر ڈگری کرائی تھی۔ وہ آدمی مانتا تھا کہ میں نے قرض لیا ہے مگر اس وقت خالی ہاتھ ہوں۔ دوں کہاں سے۔ جو لوگ وہاں کھڑے تھے انھیں بھی ترس آیا۔ انھوں نے لالہ سے کہا کہ "بھائی تم نے جہاں اتنے دنوں صبر کیا تھوڑے دنوں اور رُک جاؤ" مگر ان کی خوشامد کا لالہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا "اچھی کہی۔ میاں جی! اچھی کہی۔ برسوں کا لہنا اور روج کی ٹال مٹول۔ بھگوان جانے ابھی کھان صاحب کی اجت اُتروائے لیتا ہوں" وہ آدمی غریب تو تھا مگر تھا بڑا غیرت والا۔ وہ تلوار لے کر لالہ کو مارنے دوڑا مگر سب نے روک لیا۔ اس کے بیوی بچے الگ روئے کہ تم یوں کرو گے تو ہماری گذر بسر کیسے ہو گی۔ اُدھر بیوی نے کہا کہ جو کچھ گھر میں ہے دے ڈالو اور پنڈ چھڑاؤ۔ توا، چکی، پانی پینے کا کٹورا، نہ جانے کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں۔ بس یہی اس گھر کی کل پونجی تھی۔ چاندی کی دو چوڑیاں لیکن ایسی پتلی جیسے تار۔ یہ ساری چیزیں اس اللہ کی بندی نے باہر بھجوا دیں۔ پہلے تو بنیا ان چیزوں کو ہاتھ لگاتا ہی نہ تھا۔ لوگوں نے بڑی کہا سُنی کی۔ ان پیادوں کو بھی بڑا ترس آیا۔ انھوں نے بھی بنیے کو سمجھایا۔ تب وہ اس پر راضی ہوا کہ پانچ روپے اصل اور دو روپے سود۔ ساتوں کے ساتوں دے دیں تو وہ پیچھا چھوڑ دے۔ مگر خاں صاحب کا کل سامان ساڑھے چار روپے کا بنتا تھا۔ خاں صاحب نے گھر میں جا کر پھر کہا کہ ڈھائی روپے کی کسر رہ گئی ہے۔ بی بی نے کہا کہ اب تو کوئی چیز رہی نہیں۔ ہاں لڑکی کے کانوں میں بالیاں ہیں۔ وہ بھی دے دو۔

وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی۔ بس ایسی جیسی ہماری حمیدہ۔

ماں اس کی بالیاں اتارنے لگی تو وہ بلک بلک کے روئی۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ کل ایک روپیہ دو آنے میری جیب میں تھے۔ فوراً خیال آیا کہ یہ ٹوپی بیچ دوں۔ بازار پاس ہی تھا۔ میں نے ایک دکاندار کو دکھائی۔ اس نے چھ روپے آنکے۔ میں نے چھ ہی لے لیے۔ لوٹ کر آیا تو پیادے خاں صاحب کو لے گئے تھے۔ میں نے اس کی بیوی کو سات روپے دیے۔ اس نے کسی کو دوڑا کر اپنے میاں کو چھڑوایا۔ دونوں نے مجھے بڑی دعائیں دیں۔ بڑا احسان مانا اور پوچھا کہ یہ روپے کیسے ادا کرنے ہوں گے۔ میں نے منع کیا۔ اس پر وہ اور بھی شکرگزار ہوئے۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ روپے آئے کہاں سے تو مجھے سارا حال بتانا پڑا۔

بھائی جان نے مجھے ننگے سر دیکھا تو بولے "ایں۔ ٹوپی کے بدلے چنے لے کھائے؟" میں اس پر کچھ نہ بولا۔ پھر ایک دن اماں جان بھائی جان کو سمجھاتی تھیں کہ "بیٹا۔ فضول خرچی نہ کیا کرو۔ اس پر انھوں نے کہا کہ "فضول خرچ اور چٹورے تو آپ کے منجھلے صاحبزادے ہیں جن کو آپ بڑا مولوی سمجھتی ہیں۔ یہ تو سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے۔" میں نے کہا "یہ بات نہیں" مگر اصل بات بھی نہ بتائی۔ آخر ایک دن اماں جان صالحہ کی مزاج پرسی کو گئیں۔ خاں صاحب کی بیوی کو معلوم ہوا تو وہ ان سے ملنے آئیں اور شاید یہ سارا قصہ بھی سنایا۔ وہاں سے لوٹ کر اماں جان نے کہا "بیٹا ہم نے تمھاری چوری پکڑ لی کہ تم نے ٹوپی کا کیا کیا۔" میں ہنس کر چپ ہو رہا۔

باپ: بے شک جو قصہ تم نے سنایا وہ ہمدردی کی اچھی مثال ہے مگر ضروری ہے کہ اپنوں کے ساتھ بھی سلوک کرو۔

بیٹا: اللہ کا شکر ہے۔ عزیزوں اور رشتے داروں میں تو کوئی ایسا نہیں

جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔

باپ : سلوک روپے پیسے سے ہی نہیں ہوتا۔ اس سے کہیں ضروری بات یہ ہے کہ اپنوں میں سے کوئی اگر غلط راستے پر چل رہا ہے تو اس کی اصلاح کی جائے۔

بیٹا : آپ درست فرماتے ہیں۔ مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔

باپ : میں نے تم سے بڑی غلطی کی۔ مجھے بہت پہلے ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ خیر اب تک جو ہوا سو ہوا۔ اب مجھے ساری قوت اس کام میں صرف کرنی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں اب اسلاح مشکل ہے مگر کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اگر تم میری مدد کرو تو کامیابی کی کافی امید ہے۔

بیٹا : اللہ نے چاہا تو آپ مجھے اپنا فرماں بردار پائیں گے۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکوں گا۔

باپ : تم اچھے اخلاق، اچھے کردار اور دین داری کا نمونہ بن جاؤ۔ یہی تمھاری مدد ہے۔ امتحان کے ڈر سے تم نے کھیل کود سے توبہ کر لی ہے مگر آج سے مرغ بازی، بٹیر بازی، گنجفہ، شطرنج، کنکوا ساری فضول چیزوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔

بیٹا : جو کچھ آپ فرماتے ہیں اس میں سرا سر میرا ہی فائدہ ہے۔ اگر میں اس میں کسی طرح انکار کروں تو آپ کی نافرمانی، اپنی خرابی، خدا کا گناہ، دنیا کی بدنامی سبھی طرح کا نقصان ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا آئندہ وہی کروں گا۔

باپ : جیتے رہو۔ آج مجھے اطمینان ہو گیا۔ خدا تمھیں دین دنیا دونوں میں سربلند رکھے۔ اچھا اب جاؤ۔ ذرا اپنے بڑے بھائی کو میرے پاس بھیج دینا۔

بیٹا : شاید آپ ان سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔
باپ : یہی ارادہ ہے۔
بیٹا : اگر اُن سے خود آپ کی گفتگو نہ ہوتی تو اچھا ہے۔
باپ : تمھارا خوف درست ہے۔ میں کئی دن سے اس پر غور کر رہا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک بار دو بدو گفتگو ہو ہی جائے۔

7

علیم باپ سے رخصت ہوکر مردانے میں پہنچا اور کلیم کو بتایا کہ ابا جان یاد فرماتے ہیں۔
کلیم : خیر تو ہے۔ آج کل ہم لوگوں پر بڑے مہربان ہیں۔
علیم : کیا پہلے مہربان نہیں تھے۔
کلیم : ان کی مہربانی کا حال کوئی سلیم سے پوچھے۔ ان کے ہاتھوں سے اکثر بیچارے کی شامت آئی ہے۔
اتنے میں سلیم دروازے میں داخل ہوا۔ سر کے بال غائب ہو چکے تھے۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں بڑے بھائی جان نہ دیکھ لیں اس لیے دبے پاؤں گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا لیکن ادھر اس نے دروازے میں قدم رکھا اُدھر کلیم نے آواز دی ___ سلیم اس کی آواز سُن کر کانپ اٹھا کر سر منڈاتے ہی

اولے پڑے۔ مگر منجھلے بھائی کو بیٹھے دیکھا تو ذرا جان میں
جان آئی۔ پاس آکر بے پوچھے کہنے لگا کہ ابا جان کے حکم سے
آج میں نے سر منڈا دیا۔

بڑا بھائی: خوب۔ بیٹے سے اچھی محبت ہے کہ بیچارے کی اچھی خاصی صورت
کو ہی بگاڑ دیا اور برسوں کی محنت کو خاک میں ملا دیا:

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

کیوں سلیم تمھارا دل تو بالوں کے لیے بہت کڑھا ہوگا۔

چھوٹا بھائی: میں تو خود بہت دنوں سے بال منڈوانے کی فکر میں تھا۔
آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ بال کٹوانے بیٹھ بھی گیا تھا
مگر آپ ناراض ہوئے تو اٹھ گیا۔

بڑا بھائی: ہاں اب مجھے یاد آیا۔ وہ جو تمھارے چار احمق دوست ہیں انھوں نے
تمھیں یہ سمجھایا تھا۔ بھلا بتاؤ ایسے کوڑھ مغزوں کو پڑھنے سے
بھی کیا فائدہ:

صحبتِ عیسیٰ بنائے خر کو انساں کس طرح
تربیت سے واقعی نااہل دانا کب بنے

چھوٹا بھائی: آپ خواہ مخواہ بیچاروں کو بُرا کہتے ہیں۔ ابّا جان نے بھی تو
وہی بات کہی۔

بڑا بھائی: ابا جان نے بیماری سے اٹھ کر کہی یا کبھی پہلے بھی کہی تھی؟

چھوٹا بھائی: نہیں پہلے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔

بڑا بھائی: پھر تو سمجھ لو کہ دماغ کی کچھ خرابی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا
تھا کہ ڈاکٹروں نے غلط دوا دے دی جس سے دماغ کو ابخرے
چڑھ گئے ہیں۔

منجھلا بھائی: یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ میں ابھی ان کے پاس سے آرہا ہوں۔ دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ کوئی بات ایسی نہیں کہ جس سے آپ کا خیال درست معلوم ہو۔

بڑا بھائی: سنا ہے آج کل نماز بہت پڑھتے ہیں۔

منجھلا بھائی: تو کیا آپ اسی کو دماغ کی خرابی کہتے ہیں۔

بڑا بھائی: اور کیا دماغ کی خرابی سے سر میں سینگ نکل آتے ہیں۔ بیماری سے اٹھے تھے کوئی بھاری جلسہ کرتے جس سے شہر میں نام ہوتا۔ اٹھے بھی تو اونگھتے ہوئے۔ دو چار بار میں نے ان کو مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا ہے نوری جلاہا تو امام بنتا ہے۔ محلّے کے سقّے، حجام، کنجڑے، مسجد کے مسافر اور یہ حضرت بھی سب کے سب ایک لائن میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ میں سچ بتاؤں مجھے تو یہ سماں دیکھ کر شرم آتی ہے۔ میں نے تو اس راستے سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ ملّا نے جن کی گذر دعوت کے لقموں اور مسجد کی روٹیوں پر ہے، خدا کی شان ہے کہ ہمارے ابّا جان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں۔ ان کے غرور کا یہ حال ہے کہ کبھی راستے میں مڈبھیڑ ہو جائے تو خیر یہ تو مجال نہیں کہ سلام نہ کریں مگر نہ بندگی، نہ آداب، نہ تسلیم۔ دور سے السلامُ علیکم کا پتھر کھینچ مارتے ہیں۔ ہاتھ یہ نہیں اٹھاتے، سر یہ نہیں جھکاتے۔ پھر تماشا یہ کہ دس قدم سے مصافحے کو ہاتھ پھیلا کر لپکتے ہیں۔ حد ہے بدتمیزی کی۔

سلیم! تمھیں بس سر منڈانے کا حکم تھا یا اور بھی کوئی حکم ہوا؟

چھوٹا بھائی: کنکوّا اڑانا، شطرنج کھیلنا، جانوروں کی لڑائی میں شریک ہونا، جھوٹ بولنا، قسم کھانا، بیہودہ بکنا، بڑے لڑکوں میں

بیٹھنا سب منع ہے۔ نماز پڑھنے کی سخت تاکید ہے۔

بڑا بھائی: اتنے بہت سے حکم دینے کی کیا ضرورت تھی۔ بس ایک بات کہہ دیتے کہ مر رہو۔

منجھلا بھائی (یہ جملہ سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ) آپ کے خیال میں یہ سب کرنا اور مرنا دونوں برابر ہیں۔

بڑا بھائی: تم خود ہی سوچو کھیل کود بند، ملنا جلنا منع۔ پھر مرنے اور جینے میں کیا فرق رہا:

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

منجھلا بھائی: میری رائے میں تو ابّا جان ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کھیل کود میں وقت لگاؤ تو پڑھو لکھو کب۔ کھیل میں خوشی تو بہت ملتی ہے مگر نتیجہ تو ہماری بُرائی ہی ہے۔ رہی بات میل جول کی۔ تو وہ برے لڑکوں سے ملنے کو منع کرتے ہیں۔ بُروں سے مل کر تو برائی ہی حاصل ہوتی ہے۔ بری عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بات بات پر ان سے تو تو میں میں ہوتی ہے۔

بڑا بھائی: پھر بھی یہ بُرے لوگ ان حجاموں، کنجڑوں اور مسجد کے مسافروں سے تو اچھے ہی ہیں جو نمازوں میں شریفوں سے مل کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسی طرح شریف بننا چاہتے ہیں۔

منجھلا بھائی: اگر شریف ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہمارے یار دوست تو ایسی شرافت پر کوئی بھلا آدمی ناز نہیں کر سکتا۔ جب یہ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں تو کون سی بدتمیزی نہیں ہوتی۔ دھول دھپّا، چھیڑ چھاڑ، مارکٹائی، دھینگا مشتی، ہاتھا پائی۔ کس کس چیز کا نام

لوں۔ دنیا بھر کی بُری باتیں ہوتی ہیں۔ نام کے شریف
حرکتیں پاجیوں کی سی، کہنے کو بھلے مانس اور عادتیں بازاریوں
جیسی۔

بڑا بھائی: مطلب یہ کہ تم ابا جان کے مرید ہو چکے ہو۔

منجھلا بھائی: اس میں کیا شک ہے؟

بڑا بھائی: سلیم! تم اپنی کہو۔

چھوٹا بھائی: میں ان سے پہلے مرید ہو چکا ہوں۔

بڑا بھائی: تمھارا مرید ہونا کوئی بات نہیں۔ تمھیں تو وہ کسی طرح اپنے
راستے پر لے ہی آتے۔ ہاں (منجھلے بھائی کی طرف اشارہ
کرکے) ان کو توڑا تو بڑی بات ہوئی۔ اب رہ گیا اکیلا میں۔

منجھلا بھائی: جناب آپ اسی وقت تک اکیلے ہیں جب تک ابا جان
سے نہیں ملتے۔ اُن سے ملے اور پُرانی عادتیں بھولے۔

بڑا بھائی: اجی بس اس خیال کو دل سے دور رکھیں:
یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

منجھلا بھائی: ابا جان سے ملنا شرط ہے۔

بڑا بھائی: آخر کریں گے کیا؟

منجھلا بھائی: سمجھائیں گے۔

بڑا بھائی: یہ کہو:
میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

منجھلا بھائی: وہ باتیں ہی ایسی کرتے ہیں کہ لوہے کو پگھلائیں، پتھر کو موم
بنائیں۔

بڑا بھائی: تو بس میں بھی جا چکا۔

منجھلا بھائی: آپ کی یہ بات تو مناسب نہیں۔

بڑا بھائی: اپنا تو یہ حال ہے کہ:
مصلحت سے نہ کبھی کام لیا اور نہ لیں
منجھلا بھائی: کیا خبر آپ کو کسی اور کام کے لیے بلایا ہو۔
بڑا بھائی: اجی تانت باجی راگ پایا۔ اس کے سوا اور کیا بات ہو سکتی ہے۔
منجھلا بھائی: اگر ابّا جان نے دوبارہ بلوا بھیجا۔
بڑا بھائی: مجھے یقین ہو جائے گا کہ ضرور ان کے دماغ میں خلل ہے۔
منجھلا بھائی: والد جیسے میرے ویسے آپ کے۔ آپ کو اختیار ہے کہ ان کی شان میں جو چاہیں کہیں۔ لیکن اتنا میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ اس ضد کا انجام برا ہوگا۔
بڑا بھائی: اتنی بات میں بھی سمجھتا ہوں مگر اس انجام کی کچھ پروا نہیں۔
منجھلا بھائی: آخر اس بگاڑ سے فائدہ کیا ہے؟
بڑا بھائی: میرا نقصان بھی کیا ہے۔
منجھلا بھائی: اور کچھ نقصان نہ سہی مگر ابّا جان ناراض ہوں گے۔ یہ کیا کچھ تھوڑا نقصان ہے۔
بڑا بھائی: بے سبب کوئی خفا ہو تو بھلا کیا کیجیے۔
منجھلا بھائی: اوّل تو ابھی اس کی نوبت آئی نہیں۔ لیکن اگر آئی تو لوگ اسے بے سبب نہ کہیں گے۔ سب آپ کا قصور بتائیں گے کہ انھوں نے بلایا اور آپ نہیں گئے۔ بھلا دنیا میں ایسا باپ کون ہوگا کہ اولاد کہا نہ مانے اور وہ خفا بھی نہ ہو۔
بڑا بھائی: آخر انھیں اس سے کیا لینا کہ میں کیا کرتا ہوں، کیا نہیں۔
منجھلا بھائی: اوّل تو کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کیا کہیں گے۔ لیکن اگر وہی کہا جو مجھ سے کہا ہے تو کیا باپ کو اس کا حق نہیں کہ وہ بیٹے کو

نصیحت کر سکے۔

بڑا بھائی: ہے۔ لیکن حمیدہ پر، سلیم پر اور تم پر۔ میں اب اس منزل سے گذر چکا۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونا کیا مناسب ہے۔ میں اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار سمجھتا ہوں۔

منجھلا بھائی: شریفوں میں یہ قاعدہ نہیں کہ اولاد بڑی ہو جائے تو ماں باپ کا ادب لحاظ کرنا چھوڑ دے۔ ابا جان داداصاحب کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ ان کے سامنے نہ حقّہ پیتے تھے، نہ پان کھاتے تھے۔

بڑا بھائی: میں نے بھی آج تک ابا جان کو الٹ کر جواب نہیں دیا۔

منجھلا بھائی: ٹھیک ہے لیکن اب یہ تبدیلی کیوں۔

بڑا بھائی: تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ اگر اب بھی ابا جان مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور مجھ سے کچھ نہ کہیں تو میں کسی طرح کی گستاخی یا بے ادبی کرنا نہیں چاہتا۔

منجھلا بھائی: یہ تو کوئی مناسب شرط نہ ہوئی۔

بڑا بھائی: نہ سہی۔ بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو:

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

منجھلا بھائی: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔

بڑا بھائی: کیا ضروری ہے کہ میں پھر بچوں کی طرح مکتب میں پڑھوں تو بیٹا کہلاؤں ورنہ فرزندی سے عاق کیا جاؤں۔

منجھلا بھائی: یہ آپ سے کون کہتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ ابا جان آپ کے بڑے ہونے کا پاس نہ کریں۔

بڑا بھائی: جب مجھے اپنا برا بھلا اور نفع نقصان سمجھنے کی عقل ہے تو

مجھ سے یہ کہنا کہ یہ کرو یہ نہ کرو گویا مجھے بدتمیز ٹھہرانا ہے۔

منجھلا بھائی: کیا انطان کی رائے کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔

بڑا بھائی: یہ بات ابّا جان کی رائے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

منجھلا بھائی: پھر تو آپ ایسا کیجیے کہ ابّا جان کے پاس جاکر گفتگو کر لیجیے۔ ایک بار بحث ہو ہوا کر کوئی بات طے پا جائے۔

بڑا بھائی: مجھے گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر آدمی اپنا اچھا بھلا آپ سمجھتا ہے۔

منجھلا بھائی: آپ کو ضرورت نہیں تو ابّا جان کو ہی سہی۔ جب آپ کو اپنی رائے پر اتنا بھروسہ ہے تو اُن سے گفتگو کرنے سے ہچکچاتے کیوں ہیں؟

بڑا بھائی: دنیا میں آج تک بحث سے کوئی بات طے ہوئی ہے جو یہ ہوگی۔

منجھلا بھائی: ہٹ دھرمی اور ضد نہ ہو تو ضرور کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔

بڑا بھائی: ہمارے ابّا جان کو بھی ایک بات کی رٹ لگ جاتی ہے: اب روزے نماز کا خیال آگیا ہے تو بس دن رات اسی کی دھن ہے۔ کچھ دن بعد دیکھ لینا کہ وہی ابّا جان ہیں، وہی ہم ہیں اور وہی کھیل تماشے ہیں۔

منجھلا بھائی: آپ مجھ سے بڑے ہیں اس لیے ابّا جان کے مزاج سے زیادہ واقفیت رکھتے ہوں گے لیکن تھوڑا بہت میں بھی سمجھتا ہوں۔ خاندان کی اصلاح کا خیال اُن کے دل میں گھر کر چکا ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ ان کے ارادے میں کوئی لغزش ہو سکتی ہے۔ ویسے آپ کے سوا سارے گھر میں کوئی اور ایسا نہیں جو اپنا پُرانا ڈھرّا چھوڑنے کو راضی نہ ہو۔

بڑا بھائی: ذرا اماں جان سے اور مجھ سے دو دو باتیں ہو جائیں پھر تمہیں آپا جان کے ارادوں کے ڈانواں ڈول ہونے نہ ہونے کا حال خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

چھوٹا بھائی: اماں جان تو آج بڑی خفا بیٹھی ہیں۔

بڑا بھائی: کیوں؟

چھوٹا بھائی: آپ کو نہیں معلوم۔ آپا جان سے اور اُن سے بڑی لڑائی ہوئی۔

بڑا بھائی: کس بات پر؟

چھوٹا بھائی: آپا جان نے بچّے کو حمیدہ کی گود میں دے دیا اور خود منہ دھونے چلی گئیں۔ نماز کا وقت نکلنے لگا تو حمیدہ نے بچّے کو بٹھا دیا اور نماز پڑھنے لگی۔ بچّہ رونے لگا۔ اتنے میں آپا جان آگئیں اور انھوں نے حمیدہ کو نماز پڑھتے میں دھکا دے دیا۔ اس کی ناک میں تخت کی کیل چبھ گئی۔ ڈھیر سا خون نکلا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ آپا جان نے کئی بار نماز کو بُرا کہا۔ توبہ توبہ۔ اماں جان نے کئی دفعہ منع کیا مگر وہ نہ مانیں۔ آخر انھوں نے تھپّڑ کھینچ مارا۔

بڑا بھائی: سچ کہو

چھوٹا بھائی: آپ خود چل کر دیکھ لیجیے۔ آپا جان کوٹھری میں پڑی رو رہی ہیں۔ صبح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔

منجھلا بھائی: ہاں کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ میں نے دیکھا سب چپ چپ ہیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ خاموشی بے سبب تو نہیں ہے۔

بڑا بھائی: نہیں گھر بھر نے متوالی کو دودں تو نہیں کھالی۔ باقاعدہ تبلیغ شروع ہوگئی ہے۔ حمیدہ کی نماز دیکھو اور یہ دیکھو کہ نعیمہ نے ذراسی بات منہ سے نکال دی تو اس کی پٹائی ہوگئی۔

منجھلا بھائی : میرے خیال سے تو یہ کوئی خاص بات نہیں کہ حمیدہ نے نماز پڑھی۔ باتیں تو بوڑھیوں کی سی کرتی ہے۔

بڑا بھائی : کیا ضروری ہے کہ بوڑھیوں کی سی باتیں کرتی ہے تو نماز بھی بوڑھیوں کی سی پڑھے۔ ابھی اس کی عمر گڑیاں کھیلنے اور ہنڈ کلیاں پکانے کی ہے روزے نماز کی نہیں۔

منجھلا بھائی : اسے اللہ نے خود نماز کا شوق دیا ہے۔

بڑا بھائی : شوق کیسا۔ زبردستی ہے۔ بڑی بیٹی، بیاہی ہوئی، اولاد والی، اس کو مارنا کونسی دین داری ہے۔ نرالا مذہب ہے:

نے کعبے نے دیر کے قابل
مذہب ہے ان کا سیر کے قابل

ایسے دین کو ہمارا سلام کہ انسان آپے سے باہر ہو جائے اور دنیا کی اچھی بری بات کو نہ سمجھے۔ ہو نہیں سکتا کہ اس کی خبر اس کی سسرال تک نہ پہنچے۔ سمدھیانے والے کیا کہیں گے۔ غیرت ہو تو سارا گھر چلو بھر پانی میں ڈوب مرے۔ شرم ہو تو کوئی کہنے میں منہ نہ دکھائے۔ پھر تم مجھ سے کہتے ہو کہ ابا جان سے بات کر دوں۔ اگر انھوں نے بھی ایسا ہی دستِ شفقت مجھ پر بھی پھیر دیا تو :

دیکھ لینا کہ چلے جائیں گے تب جان سے ہم

اور مجھ کو تو نعیمہ کے بچنے کی بھی کوئی امید نہیں :

سن لیجیو کہ آج اگر ہے تو کل نہیں

منجھلا بھائی : اس بات کا تعجب تو مجھ کو بھی ہے لیکن جب تک اماں جان کے منہ سے ساری بات نہ سن لوں کہہ نہیں سکتا کہ انھوں نے ٹھیک کیا یا غلط۔

بڑا بھائی: اگر تمھارے ساتھ یہ سلوک ہوا ہوتا تو جا بے جا کا فیصلہ کرنے میں اتنا سوچ بچار نہ کرتے:

جس پہ بیتی ہو یہ وہی جانے
جو کہ بے درد ہو وہ کیا جانے

منجھلا بھائی: ہو سکتا ہے آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ یعنی مجھ پر بیتے تو کون جانے رائے بدل جائے۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ ماں باپ کو، اگر ضروری ہو تو سختی کرنے کا حق ہے۔

بڑا بھائی: ایسی ہی باتوں نے تو ان کو شیر کر دیا ہے۔

منجھلا بھائی: ماں باپ خود سمجھتے ہیں کہ انھیں اولاد پر کتنا حق حاصل ہے، کتنا نہیں۔

بڑا بھائی: تمھارا خیال ہے کہ ماں باپ کو اختیار ہے کہ اولاد بڑی ہو جائے تو بھی اسے بدتمیز بچوں کی طرح پیٹیں تو کوئی بری بات نہیں۔

منجھلا بھائی: میں اتنا تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب بہت ہی ضروری ہو گیا ہوگا تو اماں جان نے آپا جان پر ہاتھ اٹھایا ہوگا۔ پھر یہ بھی طے ہے کہ جتنی محبت آپا جان سے ان کو ہو سکتی ہے۔ کسی اور کو نہیں ہو سکتی۔

بڑا بھائی: خیر کچھ بھی ہو:

میرے وحشت خانے میں جوشِ جنوں کی دھوم ہے
عافیت مفقود اور آسودگی معدوم ہے

بھائیوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں رسولن خادمہ دوڑی ہوئی آئی اور علیم سے بولی "میاں پوچھتے ہیں۔ تم نے میری بات کا ہاں نا میں کوئی جواب نہیں دیا۔" علیم نے اُسے

یہ جواب دے کر لوٹا دیا کہ "جا کر کہہ دو ابھی آتے ہیں ۔"
اور بڑے بھائی سے کہا " ابا جان آپ کا انتظار کر رہے ہیں ذرا دیر کے لیے کھڑے کھڑے ہو آئیے "

بڑا بھائی : اگر مجھے یقین ہوتا کہ کھڑے کھڑے ہو آنے سے کام بن جائے گا تو میں اب تک کبھی جا کر ہو آیا ہوتا ۔

منجھلا بھائی: یہ آپ نے کیسے جانا کہ ذرا دیر کو جانے سے کام نہ بنے گا ۔

بڑا بھائی : خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا ۔

منجھلا بھائی: بس شاید ابا جان آپ کے منہ سے یہی سننا چاہتے ہیں ۔

بڑا بھائی : اصل میں میں ابا جان کے مزاج سے ڈرتا ہوں اور اپنی عادت سے مجبور رہوں ۔

منجھلا بھائی: جانے میں تو اس کا شبہ ہی ہے کہ بات بگڑے گی مگر نہ جانے میں تو اس کا یقین ہے ۔

بڑا بھائی : شبہ تمھیں ہے مجھے نہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ بالا خانے پر چڑھا اور مصیبت آئی ۔

منجھلا بھائی: آپ بڑے ہیں ۔ میرے لیے مناسب نہیں کہ آپ کو مجبور کروں ۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہے کیجیے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس کا انجام برا ہوگا ۔

بڑا بھائی : خیر اب جو بھی ہو ۔ ہم نے تو فیصلہ کر لیا :

اب ناؤ لگے پار کہ منجدھار میں ڈوبے

منجھلا بھائی: تو پھر میں آپ کا جواب ابا جان تک پہنچا دوں ۔

بڑا بھائی : جو تم مناسب سمجھو ۔ میں بلانے پر جانا ضروری نہیں سمجھتا تو جواب دینے کو کب ضروری جانتا ہوں ۔

منجھلا بھائی مایوس ہو کر اٹھا اور تھوڑی دور جا کر پھر لوٹ آیا ۔

کہنے لگا۔
"میرے تو قدم نہیں اٹھتے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کے نہ جانے سے بڑی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ دنیا آپ ہی کو برا کہے گی کہ باپ نے بلایا اور نہ گئے۔ چلے جاتے چاہے ان کی بات مانتے یا نہ مانتے۔ اب آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں کسی طرح شریک نہ ہوں۔ اگر آپ جانا نہیں چاہتے تو کسی دوسرے کے ہاتھ کہلا بھیجیے۔
بڑا بھائی: انھوں نے مجھ سے تو کچھ کہا نہیں۔ میں کچھ کیوں کہلا بھیجوں۔
یہ جواب سن کر منجھلا بھائی بیچارہ پھر عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ باپ کا تقاضا تھا کہ جواب دو اور جو جواب ملا وہ پہنچانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ جواب بھائی کی تباہی کا سبب بنے گا۔ اس کی تباہی کی کوئی بات وہ اپنے منہ سے نکالنا نہ چاہتا تھا۔ اسی پریشانی میں ماں کے پاس پہنچا اور کہا "اماں جان۔ غضب ہو جائے گا" وہ بیچاری پہلے ہی نعیمہ کی سوچ میں بیٹھی تھی۔ نعیمہ سارے دن کوٹھری میں فرش پر پڑی رہی۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اس کا بچہ بھوک سے روتا رہا۔ سب نے کوشش کی مگر اس نے تالو سے زبان نہ لگائی۔ دن تو خیر کسی طرح برے بھلے گزر بھی گیا۔ رات آئی تو اور قیامت آئی۔ صالحہ کو بلوایا تھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ رات کو تو مولوی صاحب کا وعظ ہے۔ کل صبح انشاء اللہ تڑکے نماز پڑھ کر پہنچوں گی۔ غرض فہمیدہ بیچاری اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اتنے میں علیم نے آکر کہا کہ غضب ہو جائے گا تو غریب کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ پوچھا "کیا ہوا؟"
بیٹا: ابا جان بھائی جان کو چار گھڑی دن سے بلائے جا رہے ہیں۔

یہ وقت ہونے کو آیا وہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مردانے میں پردہ کرادوں۔ آپ ذرا چل کر سمجھا دیجیے۔ شاید مان جائیں۔ میں تو کہہ کہہ کر ہار گیا۔

فہمیدہ کا حال نعیمہ سے بدتر تھا۔ لوگوں کی کہاسنی سے وہ دسترخوان پر بیٹھ تو گئی مگر ایک لقمہ حلق سے نہ اترا۔ بس منہ جھوٹا کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بار بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کوٹھری کے پاس جاتی۔ کواڑوں کے پاس کھڑی ہوکر درزوں میں سے جھانکتی اور نعیمہ کے رونے کی آہٹ لیتی۔ بار بار کسی نہ کسی کو بھیجتی کہ کسی طرح نعیمہ کو مناؤ۔ لیکن کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ کوٹھری کے اندر قدم رکھے۔

جس خادمہ نے نعیمہ کو پالا تھا اُسے بڑا ناز تھا کہ نعیمہ اس کا کہا ضرور کر دے گی۔ وہ لڑکے کو لے کر دودھ پلوانے کے بہانے سے پاس جا کر بیٹھی۔ ابھی منہ سے بات بھی نہ کہنے پائی تھی کہ نعیمہ نے ایسی دولتی چلائی کہ وہ بیچاری کئی لڑکنیاں کھا کر گیند کی طرح لڑھکتی نڑکاتی باہر آکر گری۔ وہ تو اللہ نے خیر کرلی کہ بچہ ننھا لچے سمیت الگ جا گرا۔ ورنہ اس غریب کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ اُس کی یہ درگت بنتے دیکھی تو سب نے منانے سے توبہ کرلی۔ جس سے فہمیدہ کوٹھری میں جانے کو کہتی وہی کانوں پر ہاتھ دھرتی کہ نہ بی بی میری ہڈیوں میں تو خدا کی لاٹھی سہارنے کا بوتا نہیں ہے۔ چاہتے سب تھے کہ کسی طرح نعیمہ کو منا کر کچھ کھلادیں مگر کوٹھری میں جانے سے ایسا ڈرتے تھے جیسے اندر کالی ناگن بیٹھی ہو کہ ڈس ہی تو لے گی۔

اُدھر نعیمہ کے بچے نے آفت ڈھا رکھی تھی۔ لاکھ جتن کرتے مگر وہ چُپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بڑی دیر بعد جب وہ روتے روتے ہلکان ہو گیا تو نانی کے کندھے سے لگ کر سو گیا۔ فہمیدہ بھی دن بھر کی تھکی ماندی

اور نہار منہ تھی ۔ اس پر دل اداس ۔ بت کی طرح ایک دیوار سے لگی اونگھ رہی تھی ۔ اتنے میں صالحہ کا جواب آیا ۔ پھر میاں علیم نے نئی خبر سنائی ۔ فہمیدہ تھوڑی دیر تو چپ سناٹے میں بیٹھی رہی ۔ ذرا دل قابو میں آیا تو علیم سے کہا "بیٹا ! تم نے بڑے بھائی کو سمجھایا نہیں ؟

بیٹا : اماں جان ! میں نے تو بہتیری کوشش کی ۔

ماں : نعیمہ کا قصہ تم نے سن لیا ؟

بیٹا : جی ہاں ۔ سنا ۔

ماں : بس خدا نے دونوں کو ایک سانچے میں ڈھالا ہے ۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ کلیم اپنے رنگ ڈھنگ چھوڑ دے گا ۔ خدا کا خوف نہ باپ کا ڈر ۔ پھر میں کون بلا ہوں ۔ یوں تم کہتے ہو تو چلو ۔ میں اپنی طرف سے بہتیرا کچھ کہہ دوں گی ۔ اب آگے اس کا نصیب ۔ کیوں علیم ! نعیمہ کے معاملے میں بتاؤ ۔ اس کی زیادتی تھی یا میری ۔

بیٹا : میں نے پوری بات تو سنی نہیں ۔ جو کچھ سنا اس سے قصور آپا کا ہی معلوم ہوتا ہے ۔ مجھے زیادہ پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ۔ میں نے تو سنتے ہی کہہ دیا تھا کہ اماں جان نے مجبور ہو کر ہی ہاتھ اٹھایا ہوگا ۔

ماں : علیم ! تم سے کیا کہوں بہت ہی گستاخ ہوگئی ہے ۔ میں تو ہر ل گیا ۔ خدا کی شان میں بھی بے ادبی کرتی ہے اور جان جان کر ، منع کرتے کرتے ۔

بیٹا : آپ نے مجبور ہو کر ہی یہ قدم اٹھایا ۔ خیر آپا کا تو ایسا کچھ نہیں ۔ آپ ہی غصہ اتر اترا جائے گا ۔ کھٹکا ہے تو بڑے بھائی کا ۔ مجھے تو کل تک ہی معاملہ آر پار ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔

ماں : دونوں ایک جیسے ہی ہیں ۔ نعیمہ نے کیا کسر اٹھا رکھی ہے ۔ سارا

دن ہوگیا۔ نہ کچھ کھایا نہ بچّے کو دودھ پلایا۔

بٹیا : آخر اسے دودھ کیوں نہ پلایا۔ اس بیچارے نے کیا کیا ہے؟

ماں : خادمہ لے کر گئی تھی۔ اس بیچاری کے ایسی لات جڑی کہ صحنچی میں ہلدی تھوپے پڑی کراہ رہی ہے۔

بٹیا : میں چل کر کچھ کوشش کروں۔

ماں : نہ بٹیا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ تم گئے اور چھوٹے تو ہو ہی۔ کچھ جا بے جا کہہ دیا تو تمھیں بُرا لگے گا۔

بٹیا : وہ بڑی ہیں۔ کچھ کہہ بھی دیں گی تو کیا ہے۔

ماں : تو بھی تمھارے جانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ میں نے صالحہ کو بلوا بھیجا ہے۔ وہ کل صبح آئے گی اور سمجھا بجھا کے راضی کرے گی۔

بٹیا : میں ایسا نہ کروں کہ انھیں ابھی جاکر لے آؤں۔ اتنے آپ بھائی جان سے بات کیجیے۔

ماں : ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں نے صالحہ سے سارا حال نہیں کہلایا ورنہ وہ سنتے ہی آتی۔

اِدھر علیم صالحہ کو لینے گیا اُدھر فہمیدہ پردہ کرا کے مردانے میں پہنچی۔ یہاں تاش کا کھیل جم چکا تھا۔ چاندنی پر تاش کے پتے بکھرے پڑے تھے۔ فہمیدہ نے کہا "آگ لگے اس کھیل کو۔ کھیل نہ ہوا مصیبت ہوگیا کہ رات کو بھی بند نہیں ہوتا۔

بٹیا : ذرا وقت کٹ جاتا ہے امّاں جان۔ نکمّا بیٹھا آدمی کچھ تو کرے: بیکار مباش کچھ کیا کر۔

ماں : بٹیا! کام تو بہتیرے ہیں۔ کوئی کرنے والا تو ہو۔ یہ نکمّے ہونے کی بات ہی تو ہے کہ باپ نے کئی دفعہ بلایا مگر تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ جاکر سُن تو آؤں کہ کیا کہتے ہیں۔

بیٹا : بس میں نے یہیں بیٹھے بیٹھے سُن لیا کہ کیا کہتے ہیں۔ کھیل کود کو منع کرتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ نماز پڑھنے کا وعدہ لیتے ہیں۔

ماں : تو اس میں کون سی ایسی بُری بات ہے۔

بیٹا : یہ پابندیاں میرے بس کی نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا بیٹھے بٹھائے ابا جان کو ہو کیا گیا۔ نئے نئے قاعدے بن رہے ہیں۔ وہی خدا ہے۔ وہی ہم سب ہیں۔ جیسے رہتے آئے ہیں ویسے ہی رہنے دیں۔ خود روزہ نماز کرنے لگے ہیں تو کرتے رہیں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔

ماں : اولاد کو کیسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ان کی درستی ماں باپ کا فرض ہے۔

بیٹا : پہلے سے فرض نہیں تھی۔ بس ابھی بیماری میں وحی آئی ہے۔

ماں : بڑے افسوس کی بات ہے بیٹا! کہ تم باپ کے لیے اس طرح کی باتیں کہتے ہو۔ تم نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان میں یہی لکھا ہے کہ ماں باپ کا اس طرح ذکر کرو۔ ایک کہاوت مشہور ہے۔ باادب با نصیب۔ تمھارے باپ نے کب کہا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔

بیٹا : اصل میں یہ سب بیماری کا اثر ہے۔

ماں : تم ان کی باتوں کو جنون بتاتے ہو لیکن ذرا جا کر بات کرو۔ دیکھنا تم پر اُن کی باتوں کا کیسا اثر ہوتا ہے۔

بیٹا : میں کوئی سلیم ہوں کہ ان کی باتوں میں آجاؤں گا۔

ماں : ہماری نظروں میں تو تم سلیم سے بھی چھوٹے ہو۔

بیٹا : بس یہ مہربانی نعیمہ پر ہی رکھیے۔

ماں : بڑے اور سمجھدار ہوتے تو کہنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

بیٹا : یہ خوب ہے کہ بڈھے طوطوں کو مار مار کر پڑھایا جائے ۔ میں اپنا بُرا بھلا آپ سمجھتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ میرے معاملے میں کوئی دخل دے ۔

ماں : ماں باپ اپنی اولاد کا بُرا نہیں چاہتے ۔ ہم لوگ تمھاری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں ۔

بیٹا : مجھے اپنی بھلائی منظور نہیں ہے ۔

ماں : تمھیں ضد چڑھ گئی ہے ۔ اس لیے اس وقت اس طرح کی باتیں کر رہے ہو ۔

بیٹا : میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اپنے معاملات میں کسی کا دخل برداشت نہیں کرسکتا ۔ آپ بیٹھے بٹھائے مجھے کیوں چھیڑتی ہیں ؟ ۔

ماں : میں تمھاری ماں اور وہ تمھارے باپ ۔

بیٹا : یہ اچھی زبردستی ہے ۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان ۔ کوئی مشورہ لے نہ لے آپ زبردستی اپنی رائے دینے پر تلی ہوئی ہیں ۔ اوّل تو میں ان نصیحتوں کو فضول سمجھتا ہوں ۔ دوسرے یہ کہ بچّہ دس بارہ برس کا ہوا تو وہ اپنا اچھا بُرا آپ سمجھنے لگتا ہے ۔ پھر ماں باپ کو دخل نہ دینا چاہیے ۔ اگر آپ لوگ یہی چاہتے تھے کہ میں بڑا ہو کر مسجد کا ملّا بنوں ، قبرستان کا قرآن خواں یا خیراتی لنگر خانے کا ٹکڑ گدا بنوں تو شروع سے مجھے اسی طرح کی تعلیم دلائی ہوتی ۔ اب تک کچھ نہیں تو در چار حج کر آیا ہوتا ۔ کوئی مرتا تو میں نماز پڑھاتا ، فاتحہ ہوتی تو مجھے کھانا ملتا ، کہیں قربانی ہوتی تو کھال میرے حصے میں آتی ، خیرات ، زکوٰۃ ، صدقہ مجھے ملتا ۔ یہ خوب ہے کہ پڑھاؤ کچھ ، پوچھو کچھ ، سکھاؤ کچھ اور چیز اور امتحان لو کسی اور چیز میں ۔

میں شریف خاندان کے لڑکوں میں سب سے اچھا نہ سہی تو

کسی سے بُرا بھی نہیں۔ مشاعروں میں میری غزل دس نوجوان شاعروں سے اچھی ہوتی ہے۔ شطرنج کھیلنے والوں میں مرزا شاہ رُخ تو پرانے کھیلنے والے ہیں اور سچ ہے کہ خوب کھیلتے ہیں مگر ان کے سوا کون ہے جو مجھے مات دے سکے۔ گنجفہ، تاش اور چوسر کم کھیلتا ہوں مگر بیسیوں سے اچھا کھیلتا ہوں۔ ہماری چھتری کے کبوتر جیسے دم دار ہیں کسی اور کے ہوں تو لیں، پتنگ ایسی اڑاتا ہوں کہ ایک دھیلے سے دو ٹھڈّے کی تُکّل ایک نہیں دسیوں کاٹی ہوں گی، لکھنے پڑھنے میں کسی سے ہیٹا نہیں۔ غرض کون سا ہنر ہے جو مجھ سے نہیں آتا:

قسمت سے تو لا چار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

کل مجھے بات بات میں شاباش ملتی تھی آج نصیحتیں ہونے لگیں:

ہائے ہم کیا کہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر

میرا کون سا شغل ہے جو آپ کو یا ابا جان کو معلوم نہیں۔ انھوں نے میری غزلیں سنیں۔ میرے شعر درست کیے۔ انھوں نے اخبار میں شطرنج کا ایک مشکل نقشہ دیکھا تو مجھے بلا کے حل کرایا۔ پتنگوں کی لڑائی جیتنے میں انھوں نے شاباش دی۔ کبوتر اڑاتے آپ نے دیکھا۔ ان سب باتوں سے کبھی آپ نے روکا یا انھوں نے ٹوکا؟ اب پابندیاں لگی ہیں کہ کھیل کود سے بچو، دوستوں سے ملنا چھوڑ دو، سیر تماشے بند کرو۔ اب یہ کیسے ممکن ہے؟

ماں: تم اپنے باپ کو پاگل اور سڑی ٹھہراتے ہو۔ مگر وہ یہ سب جانتے ہیں کہ تمھاری اصلاح اب ممکن نہیں۔ شروع میں تمھاری تربیت درست نہ ہوئی اس کا خود انھیں بڑا ملال ہے۔ کاش تم ان کے پاس چلتے اور ان کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔

بیٹا: خیر انھیں اس کا ایسا ہی ملال ہے تو دوسرے بچوں کی اصلاح کریں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ نے مجھے سمجھا کے دیکھ لیا بس آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ جو آپ کی بات مان رہے ہیں انھیں اپنے راستے پر چلائیے۔

ماں: گھر کا رنگ ڈھنگ بدلنا ہے تو سبھی کو بدلنا ہوگا۔

بیٹا: میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ کھڑاگ میرے بس کا نہیں۔ یہ سر حاضر ہے۔ چاہے نعیمہ کی طرح مجھ کو بھی دو چار جوتیاں مار لیجیے۔

ماں: یہ تمھاری ضد ہے، بیٹا!

بیٹا: یوں ہی سمجھ لیجیے۔

ماں: بھلا یہ بھی سوچا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

بیٹا: کیا ہوگا۔ بہت کریں گے خفا ہوں گے۔ دو چار دن ان کے سامنے نہ پڑوں گا۔ پھر آپ کہہ سن کر معاملہ رفع دفع کرا دیں گی نا۔ کیوں بی اماں کرا دیں گی نا؟

ماں: اگر اتنی سی بات ہوتی تو اتنا غم نہ تھا۔

بیٹا: پھر کیا مجھے پھانسی دلوا دیں گے، مار ڈالیں، آخر کیا کریں گے؟

ماں: پھانسی کون دیتا ہے۔ ذرا نعیمہ کے ہاتھ لگا دیا تھا تو دیکھا کیا ہوا۔

بیٹا: شاید یہ کریں کہ گھر سے نکال دیں۔

ماں: کیا خبر کیا ہوگا۔

بیٹا: میں ان کی خفگی سے تو ذرا ڈرتا بھی ہوں لیکن گھر سے نکلنے کی ذرا پرواہ نہیں۔ اپنے کھانے کپڑے پر گھمنڈ کرتے ہوں گے۔ اُن جیسے دس کو روٹی کپڑا دے سکتا ہوں۔ شاید اسی کی دھمکی دیتے ہیں۔ میں پہلے ہی گھر سے تنگ ہوں۔ اگر پہلے سے ذرا خبر ہوتی کہ یہ ہونے والا ہے تو گھر سے ایسے جاتا جیسے گدھے کے سر سے

سینگ۔ اور اب دیکھ لینا۔

ماں: تم باپ سے ابھی ملے نہیں۔ بات ہوئی نہیں اور غصّہ کرنے لگے۔

بیٹا: آپ خود ہی دیکھیے۔ چھیڑ چھاڑ اُن کی طرف سے ہوئی یا میری طرف سے۔

ماں: تم نصیحت کو چھیڑ چھاڑ کہتے ہو۔ دوسری بات یہ کہ سارے گھر سے ناراض ہونے کا کیا سبب۔ آخر ہم سب نے کیا قصور کیا؟

بیٹا: آپ سب بھی تو اُن کی سی کہتے ہیں۔ اگر آپ کو میرا ایسا ہی خیال ہے تو میرا ساتھ دیجیے۔

ماں: اگر تمھارے باپ کی زیادتی ہوتی تو میں تمھاری طرف داری کرتی۔ انسان وہ کام کرے کہ دس آدمیوں میں بات پڑے تو لوگ الزام نہ دیں۔ اگر تم ذراسی بات پر گھر چھوڑ دو گے تو سب تمھاری ہی خطا بتائیں گے۔

بیٹا: میں کسی کی رعیّت تو ہوں نہیں جب اپنے سگے باپ کے کہنے کی پرواہ نہیں کرتا تو اور کسی کا کیا ڈر۔ لوگ پڑے بھونکا کریں۔

ماں: ایسی آزادی دنیا میں رہ کر تو نبھ نہیں سکتی۔

بیٹا: ابھی دیکھیے گا کہ کیسی نبھتی ہے۔

ماں: تو کیا تم گھر سے چلے جاؤ گے۔

بیٹا: مجھے روک بھی کون سکتا ہے:

ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ماں: روکنے والی میں بیٹھی ہوں۔ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں۔ میں نے تمھیں اس لیے پالا پوسا تھا کہ جب بہار دیکھنے کے دن آئیں تو تم الگ ہو جاؤ۔ (اتنا کہہ کر فہمیدہ کا دل بھر آیا۔ پھر بولی) کلیم! سچ کہتی ہوں اگر تو نے جانے کا نام لیا تو قیامت تک دودھ نہ

بخشوں گی ۔

بیٹا: یہ بھی سہی ۔

ماں: آخر جانے میں ایسی کیا بھلائی ہے کہ نہ باپ کو ناراض کرنے کا خیال، نہ ماں اور بہن بھائیوں کے غم کا لحاظ ۔

بیٹا: اب تو دل میں یہی بات ٹھنی ہے ۔ مدتوں سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا تھا۔ خیال آتا تھا کہ ذرا باہر کی ہوا بھی کھاؤں :

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں

ماں: گھر سے ناراض ہو کر جاؤ گے تو باپ دادے کا نام خوب اچھلے گا۔

بیٹا: جب باپ نے میرا پاس نہ کیا تو خاندان کی عزت رہے تو بلا سے اور جائے تو بلا سے ۔

ماں: خاندان کی عزت کو تو چھوڑ دو مگر اتنا سمجھ لو کہ تم نے گھر سے باہر قدم رکھا اور تمھاری بات دو کوڑی کی ہوئی ۔ یار دوست جو رات دن تمھاری للّو پتّو میں لگے رہتے ہیں ملنے سے کترائیں گے ۔ مدد کرنی تو الگ رہی ۔

بیٹا: گھر سے نکل کر کوئی بس نے دہلی میں رہنے کی قسم کھائی ہے ۔ جدھر کو منہ اٹھ گیا چل کھڑے ہوئے ۔

ماں: تم باپ کو باؤلا دیوانہ بتاتے ہو مگر باولوں دیوانوں کی سی حرکتیں تم خود کرتے ہو ۔ دیکھو کہے دیتی ہوں بہت پچھتاؤ گے ۔ بہت افسوس کرو گے ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میری بات مان لو مگر جسے سمجھدار سمجھتے ہوں اس کی صلاح بھی لے دیکھو ۔ عیش آرام، عزیز رشتے دار گھر بار خواہ مخواہ چھوٹے گا اور بدنامی، محتاجی، تکلیف اور پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا ۔

بیٹا: خیر اپنی اپنی رائے ہے ۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے خادمہ نے ایک خط کلیم کے ہاتھ میں لاکر دیا فہمیدہ سمجھ گئی کہ ضرور کلیم کے باپ کا خط ہے۔ کلیم خط پڑھتا رہا۔فہمیدہ چپ بیٹھی دیکھا کی۔ خط پڑھ چکنے کے بعد کلیم نے پھر وہی سلسلہ شروع کرنا چاہا۔ مگر فہمیدہ نے پوچھا "باپ نے کیا لکھا ہے؟"

بیٹا: ان کو تو تم جانتی ہو۔ جس بات کے پیچھے پڑتے ہیں تو پہروں کی خبر لاتے ہیں۔ پھر بلایا ہے۔

ماں: صرف بلاوے کا اتنا بھاری خط۔ ذرا میں بھی دیکھوں۔

فہمیدہ نے خط لے کر پڑھا۔ خط میں پہلے تو اس بات کی شکایت تھی کہ تمھیں بار بار بلایا مگر تم نہ تو آئے اور نہ یہ ضروری سمجھا کہ اگر کوئی مجبوری ہے تو کہلا بھیجو، کہ پھر کسی وقت مل لوں گا۔ اس کے بعد بڑی محبت سے سمجھایا تھا کہ تم سب سے بڑے بیٹے ہو۔ضروری ہے کہ تم چھوٹوں کے لیے خود کو نمونہ بناؤ۔ جو فضول شوق تم نے اپنا رکھے ہیں ان کا چھوڑنا بھی ضروری ہے۔ اس سے بھی ضروری بات یہ ہے کہ دین سے غافل نہ رہو۔ آخر میں صاف صاف یہ بھی لکھ دیا تھا کہ جو میری ان باتوں کو نہ مانے میں اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔

خط پڑھ کر فہمیدہ بیٹے سے کہنے لگی "دیکھا؟"

بیٹا: جو کچھ خدا دکھائے سو نا چار دیکھنا۔

ماں: کیا اب بھی تم باپ کو دیوانہ سمجھتے ہو؟

بیٹا: اب کیا شک رہ گیا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں۔

ماں: کیا اب بھی باپ کے پاس نہ جاؤ گے؟

بیٹا: اب جانے کی کیا ضرورت رہ گئی۔ اب تو وہ سمجھ ہی گئے کہ میں ملنا نہیں چاہتا۔

ماں : تمھارے باپ نے کوئی بات بے جا نہیں لکھی ۔ جو سنے گا تم کو ہی قائل کرے گا ۔ میں کہتی ہوں کہ رات کو اطمینان سے ایک بار اس خط کو پڑھنا ۔ پھر کوئی فیصلہ کرنا ۔

8

ابھی فہیدہ کلیم کو سمجھا ہی رہی تھی کہ صالحہ کی ڈولی آ پہنچی ۔ علیم نے اس سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ نعیمہ آپا روٹھ گئی ہیں ۔ اب فہیدہ نے اسے ساری تفصیل بتائی ۔ صالحہ عمر میں تو نعیمہ سے چھوٹی تھی مگر تھی بڑی عقل مند ۔ اس نے کہا " میں آپا کو ضرور رضامند کروں گی مگر شرط یہ ہے کہ جدھر وہ لیٹی ہیں اُدھر کوئی آئے نہیں ورنہ انھیں شرمندگی ہوگی اور ان کا راضی ہونا مشکل ہو جائے گا!"

بات صالحہ کی درست تھی ۔ جب کسی کی بے عزتی ہوتی ہے تو وہ ان سب کو اپنا دشمن ٹھہرا لیتا ہے جن کے آگے اُس کی کرکری ہوئی ہے ۔ پھر ان میں سے کوئی سامنے پڑ جائے تو اس کا غصہ اور بڑھتا ہے ۔ خادمہ بیچاری نے جو بے بات دولتی کھائی تو اسی وجہ سے ورنہ اس کا کیا قصور تھا ۔ نہ بیچ میں بولی نہ دخل دیا ۔

غرض صالحہ کی تجویز فہیدہ کو پسند آئی ۔ سب سے کہ دیا

کہ اس طرف کوئی نہ جائے۔ صالحہ نے خالہ سے کہا کہ "آپ کو ٹھے پر جا سوئیے" اس پر فہمیدہ نے بتایا کہ "میاں کلیم سے چھٹم چھٹا ہو رہی ہے۔ نہ باپ کا کہا مانتے ہیں، نہ اُن سے جا کر ملتے ہیں۔ باپ کو دیوانہ اور سودائی بتاتے ہیں۔ نمازیوں کو ملّانے، قلاؤذیے، بھک منگے اور ٹکڑ گدے کہتے ہیں" صالحہ کو یہ باتیں سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ گھر میں اور کسی نے بھی کھانا نہ کھایا۔ اس نے کہا آپ سب کھانا کھا لیجیے۔ آپا کی فکر نہ کیجیے۔

یہ کہہ کر صالحہ صحن میں سے ہی پکاری "کیوں بی۔ میری آپا کہاں ہیں۔ گھر میں کوئی ہو تو بولے۔ پہلے باورچی خانے میں گئی وہاں کوئی نہ ملا۔ دالان میں آئی تو وہاں بھی سناٹا۔ غرض جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر ٹہل کر سہ دری والی کوٹھری کے پاس آکر جھانکنے لگی جہاں نعیمہ تھی۔ پہلے تو وہ فرش پر ہی پڑی تھی مگر صالحہ کی آواز سنتے ہی وہ جلدی سے اٹھی اور منہ لپیٹ کر پلنگ پر جا لیٹی اور دروازے کی طرف پیٹھ کر لی۔ صالحہ پہلے تو جان کر انجان بن گئی اور پوچھنے لگی "یہ پلنگ پر کون لیٹا ہے" پھر آپ ہی بولی "آہا آپا ہیں۔ ایں اکیلی کوٹھری میں اور اتنے سویرے" اتنا کہا اور دوڑ کر نعیمہ کو لپٹ گئی۔

صالحہ کی آواز سُن کر نعیمہ بھی بڑی حیرت میں کہ سان نہ گمان یہ ایک دم کدھر سے آموجود ہوئی۔ مگر یہ وہ سوچ ہی نہ سکتی تھی کہ یہ بلوائی ہوئی آئی ہے۔ نعیمہ ایسی بن گئی جیسے دیر سے پڑی سوتی ہو اور بھاری نیند سے بوجھل آواز بنا کے بولی "کون ہے بھئی۔ ہمیں دق نہ کرو۔ سونے دو"

صالحہ: ہائے بی آپا۔ میں ہوں صالحہ۔ اٹھو منہ کھولو۔ ابھی سے کیوں سو رہی ہیں۔ جی کیسا ہے؟

نعیمہ نے طے تو یہ کیا تھا کہ صالحہ سے کچھ نہ کہے گی مگر اس نے

ایسی ہمدردی سے پوچھا کہ نعیمہ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ رونے لگی۔ اب تو صالحہ نے اور خوشامد سے پوچھا "کیا سر دُکھتا ہے۔ پیٹ میں درد ہے۔ بچّے کا جی کیسا ہے۔ سسرال والوں نے کچھ کہلا بھیجا ہے۔ گھر میں کسی سے اَن بَن ہو گئی" صالحہ پوچھتی رہی مگر نعیمہ نے کچھ نہ بتایا۔ آخر صالحہ نے کہا "سچّی بات نہ بتاؤ تو میرا مرا مُنہ دیکھو"۔ تب صالحہ نے کہا "چل مکّار تجھے پتہ نہیں۔ مجھ سے باتیں بناتی ہے"۔

صالحہ: کون بتاتا۔ یہاں آکر دیکھا تو نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ خالہ امّاں اور سب مردانے میں ہیں۔ بس اتنا سنا کہ بڑے بھائی خفا ہو کر گھر سے جا رہے ہیں۔

نعیمہ: بڑے بھائی کیوں گھر چھوڑے جا رہے ہیں۔

صالحہ: بس اتنا سنا کہ خالو ابّا نے بلا یا تھا یہ نہ گئے۔ انھوں نے کچھ نصیحتیں کیں مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔

نعیمہ: آگ لگے ان نصیحتوں کو۔

صالحہ: تو کیا تم بڑے بھائی کے لیے بڑی رو تی تھیں۔

نعیمہ: مجھے تو اس کی خبر بھی نہیں۔ میں تو آپ ہی نکلنے کو بیٹھی ہوں۔

صالحہ: توبہ آپا۔ کیسی بُری بات منہ سے نکالتی ہو۔ خدا نہ کرے کسی بھلے مانس کی بیٹی بہو گھر سے نکلے۔

نعیمہ: صالحہ! دو چار دن رہ کے ہمارے گھر کا رنگ ڈھنگ دیکھنا۔ نہ وہ زمین رہی نہ آسمان۔ اس گھر کا باوا آدم ہی بدل گیا۔ اب تو نہ وہ پہلی سی ہنسی دل لگی ہے نہ وہ چہلیں۔ کوئی دن تھا کہ سارے محلے کی عورتیں یہاں جمع رہتی تھیں۔ کوئی نئی نئی نقلیں کر رہی ہے کوئی گیت گا رہی ہے۔ کوئی کہانی سُنا رہی ہے۔ کسی کے چٹکلے

سُن کے سب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوتے جا رہے ہیں۔
اور اب۔ اب تو کوئی آکر تھوکتا بھی نہیں سارا گھر پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے۔

صالحہ: آخر یہ کیوں؟

نعیمہ: یہ سب تمھاری خالہ امّاں اور خالو ابّا کا کرم ہے۔ اب نہ کسی کی وہ پہلی سی خاطرداری ہے اور نہ زندہ دلی۔ ہر وقت منہ پھول کر کپّا بنا رہتا ہے۔ ابّا جان کے اچھا ہونے پر ڈومنیوں نے سیکڑوں پھیرے کیے کہ ناچ گانا کرالو۔ ہمسائی نے منّتیں کر نقل کرالو، ہم کہہ کہہ کے ہار گئے کہ رت جگا تو کرالو مگر انھوں نے مسجد کے ملّاؤں کو کھلایا۔ لنگڑے لُولوں کو کپڑے بنائے۔ بھک منگوں کو خیرات دی۔ جب دیکھو نماز کا چیتھڑا بچھا ہے۔ وضو کا لوٹا رکھا ہے۔ ایک حمیدہ کٹنی ایسی مل گئی ہے کہ ہر وقت خوشامد میں لگی رہتی ہے۔ اُسی نے امّاں جان سے مجھے بُرا بنوایا۔ خیر۔ الٰہی حمیدہ بندی تجھ کو انھیں ہاتھوں سے امّاں جوتیاں ماریں تب میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے۔ آجکل تو جیسی ان کی نظروں میں چڑھی ہے ویسی ہی نظروں سے گرے۔ جب میری مراد پوری ہو۔

صالحہ نے حمیدہ سے اتنے خفا ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے سارا ماجرا سنایا مگر صالحہ نے الٹا نعیمہ کو قائل ہی کیا اور سمجھایا کہ حمیدہ بے قصور تھی۔ نماز کی اہمیت بھی جتائی۔ پھر بتایا کہ نیک، محنتی، ایماندار اور دوسروں کے کام آنے والوں کا دو جہان میں رتبہ بلند ہے۔ اس کی مثال کے لیے صالحہ نے حضرت بی کا نام لیا۔

نعیمہ: کون حضرت بی؟

صالحہ: حضرت بی یہیں تمھارے پڑوس میں رہتی ہیں۔

نعیمہ : میں نے اکثر ان کو دن دن بھر کپڑے سیتے دیکھا ہے۔
صالحہ : ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ غریب غربا کے کپڑے مفت اور امیروں کے مزدوری پر سیتی ہیں اور جتنی مزدوری ملتی ہے وہ ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتی ہیں۔ یہ عمر دیکھو اور کڑاکے کے جاڑوں میں پہر رات رہے سے اٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگتی ہیں۔ گھر میں نوکر چاکر نہیں سارا کام کاج اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ محلے کی کتنی لڑکیوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مسجد کے پندرہ پندرہ بیس بیس مسافر دونوں وقت روٹی پکوانے کو آٹا بھیج دیتے ہیں۔

آٹا گوندھنا اور روٹی پکانی تو الگ جو سالن موجود ہو وہ بھی بھیج دیتی ہیں۔ اکثر دیکھا کہ سارا سالن وہاں بھیج دیا اور اپنے لیے چٹنی رگڑ لی یا روکھی سوکھی کھا لی۔ اکثر مسافر جوار باجرے کا آٹا بھیجتے ہیں یہ وہ آٹا اپنے لیے رکھ لیتی ہیں ان کے لیے گیہوں کی روٹی پکا دیتی ہیں۔ ایک دن باجرے کی روٹی اور وہ بھی روکھی بیٹھی کھا رہی تھیں۔ نوالہ حلق سے نہیں اترتا تھا۔ ہر لقمے پر پانی کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں جا نکلی تو مجھے دیکھ کر کہنے لگیں "بیٹا! مجھ کو باجرے کی روٹی بہت بھاتی ہے۔ کچھ ایسی سوندھی، میٹھی اور خستہ ہوتی ہے کہ سبحان اللہ۔

ایک بار ایک طالب علم گاڑھے کی مرزئی سلوانے آیا۔ انھوں نے کہا ناپ کے لیے پرانی مرزئی بھیج دو۔ اس نے کہا پرانی مرزئی میرے پاس کہاں۔ انھوں نے کہا انگرکھا ہی بھیج دو۔ کچھ تو اٹکل مل جائے۔ اس غریب کے پاس وہ بھی نہ تھی۔ مجبوراً حضرت بی نے پردے کے اندر سے ہی پوچھ لیا۔ کہ کتنی ہے، چولی کتنی نیچی رہے گی، آستین کتنی لمبی ہوگی۔ اب دیکھا تو کپڑا کم۔ اس غریب نے کہا اسی میں کھینچ تان کے بنا دو۔ آج آخری جمعہ ہے۔ اسی کو پہن کر نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے سی دی۔

مگر وہ اس کے بدن پر ٹھیک نہ آئی۔ وہ بیچارہ مایوس ہوکر رو دیا اور غصے میں حضرت بی پر اتنا بگڑا کہ کوئی گھر کی خادمہ پر بھی نہیں بگڑ سکتا۔ نڈھی، بے وقوف، بے تمیز، پھوہڑ، بدسلیقہ، بے رحم جو کچھ اس کے منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ گھر میں سب کو برا لگا لیکن حضرت بی شرمندہ تھیں اور الٹی اس کی خوشامد کرتی تھیں۔

حضرت بی نے بڑے نواسے کا چکن کا کرتہ اس کو دیا لیکن اس نے اٹھا کر پھینک دیا کہ یہ واہیات کپڑا میرے کس کام کا۔ مجھے تو تن ڈھکنے کے لیے کپڑا چاہیے۔ اسے پہن کر تو آدمی ننگے کا ننگا رہتا ہے۔ حضرت بی نے اپنے نواسوں کی ساری گٹھریاں کھول ڈالیں۔ خاصہ، تن زیب، ململ، ڈھاکہ، پاٹن، ڈوریہ، رینگ، شبنم، نینوں، سینوں، سوزن کار۔ طرح طرح کے کپڑے دکھائے مگر کسی کو اس نے کہا مردوں کے قابل نہیں، کسی کو کہا مغرور لوگوں کا لباس ہے۔ تب حضرت بی نے نماز سے پہلے بازار سے کورا لٹھا منگا کر اس کی مرزئی تیار کی۔ تب کہیں وہ ٹلا۔

نعیمہ: ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں؟

صالحہ: بہتیرے ہوتے ہیں۔ تم اس طرح کے لوگوں سے نفرت کرتی ہو۔ ورنہ اسی شہر میں بہتیرے اللہ کے نیک بندے موجود ہیں۔

نعیمہ: تم تو اچھی خاصی مولوی ہو۔ افسوس ہے کہ تم ہماری اماں کے گھر پیدا نہ ہوئیں۔

صالحہ: افسوس کی کیا بات ہے بلکہ میں تو سمجھتی ہوں شکر کا مقام ہے۔ تم نے کیا سمجھ کر افسوس کیا۔

نعیمہ: میں نے یہ سوچ کر افسوس کیا کہ ہماری اماں تم جیسی بیٹی ڈھونڈتی ہیں۔ تم بھی امیر گھر پاتیں تو کھانا، کپڑا، نوکر سبھی چیزوں کی آسائش ہوتی۔

صالحہ : ایسی خوشی جس سے آدمی خدا کو بھول جائے۔ اور بڑوں کا ادب نہ کرے وہ کس کام کی۔ مجھے خدا کے کرم سے پیٹ بھر روٹی، تن ڈھکنے کو کپڑا، رہنے کو مکان، لیٹنے کو چار پائی، پینے کو پانی، دم لینے کو ہوا۔ سب کچھ میسر ہے۔ بس اور کیا چاہیے۔ رہی بات سونے چاندی کی۔ تو سوائے بوجھ لادنے کے اس کا فائدہ ہے کیا۔ اب تم خود ہی دیکھ لو۔ کان کٹے پڑتے ہیں۔ ناک چھی گئی ہے۔ ویسے تم اپنی تندرستی دیکھ لو۔ کھانے پینے کو سب کچھ موجود ہے مگر تن پر بوٹی نہیں۔ ہاتھ پاؤں میں جان نہیں۔ جب دیکھو دوا چل رہی ہے۔ میں تم سے دونی نہیں تو ڈیوڑھی تو ضرور ہوں۔ ایک ہاتھ سے تمھارے دونوں ہاتھ پکڑ لوں تو تم سے ہلا نہ جائے۔

نعیمہ : جی خوش کرلو۔ لومڑی کے ہاتھ انگور نہ آئے تو بولی کھٹے ہیں۔

صالحہ : اپنی اپنی سمجھ ہے۔ تم سمجھتی ہو میں تکلیف میں ہوں اور میرا خیال ہے تم ایسے عذاب میں ہو کہ خدا دشمن کو نہ دے۔ جو عیش آرام تمھیں میسّر ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ تم سدا کی دُکھیا اور ہمیشہ کی روگی ہو۔ رہا کپڑا سو وہ تم ایسا پہنتی ہو کہ خالو ابّا یا بڑے بھیّا آجائیں تو سوائے اس کے کہ ہٹ بیٹھو اور کیا کرسکتی ہو۔ خوشی میل محبّت کی ہوتی ہے سو تمھارا حال یہ ہے کہ ساس سسروں سے بگاڑ، ماں سے لڑائی، ماں باپ ناخوش۔ ابھی پڑی تم رو رہی تھیں یا ہنس رہی تھیں؟

نعیمہ : خوب، آپ بھی کمال کی آدمی ہیں۔ گھر کے لوگوں میں لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا؟ چار برتن پاس رکھ دو تو کبھی نہ کبھی کھڑکھڑا ہی اٹھتے ہیں۔

صالحہ : اگر تم یہ بات سمجھتیں تو بات کا بتنگڑ نہ بناتیں۔

نعیمہ : میں نے کیا بات کا بتنگڑ بنایا؟

صالحہ: ذرا دل میں سوچو۔ ماں کے ہاتھ لگانے پر یہ آفت۔ صبح سے اب تک بھوکی مریں اور سارے گھر کو بھوکا الگ مارا۔ بے زبان بچّے کا کچلا کیا۔

نعیمہ: اپنا بچّہ تھا۔ مارا یا کچلا کیا۔

صالحہ: بچہ تمھارا تھا تم نے مار لیا۔ تو جیسے وہ تمھارا بچہ۔ ایسے تم خالہ جان کی بچی۔ انھوں نے ایک تھپڑ مار دیا تو کیا غضب کیا۔

نعیمہ: اللہ، تم بھی کیا اینچ پینچ کی باتیں کرتی رہو۔

صالحہ: ایں، یہ اللہ کا نام تمھاری زبان پر کیسے آگیا؟

نعیمہ: کیوں، کیا میں اللہ کو نہیں مانتی۔

صالحہ: مانتیں تو ایسی بات زبان پر نہ لاتیں۔ نماز کو بُرا بھلا نہ کہتیں۔

نعیمہ: میں نے جان بوجھ کر تھوڑی کہی تھی۔ بس منہ سے نکل گئی۔

صالحہ: لیکن کبھی ایسی بات خالو جان کے لیے منہ سے نہ نکلی۔ خالو جان کی بات چھوڑ دو۔ بڑے بھائی کے خلاف بھی کوئی بری بات کہتے ڈروگی کہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ کیا خدا کو بُرا نہ لگا ہوگا؟

یہ سُن کر نعیمہ ذرا ڈری۔ اس نے ہولے ہولے اپنے دونوں ہاتھوں سے گالوں پر طمانچے مارے اور منہ سے بھی توبہ توبہ کہا۔

صالحہ: بس سمجھ لو کہ ایسا ہی ایک طمانچہ خالہ جان نے مار دیا۔

نعیمہ: تو میں نے کب کچھ کہا۔

صالحہ: اے کاش تم کچھ کہ لیتیں مگر بچّے پر یہ ستم نہ کرتیں۔ بچّہ بیچارہ سارے دن دودھ کو پھڑکا۔ جس نوکرانی کے تم نے

لات جڑی تھی وہ بیچاری سہ درے میں پڑی ہائے ہائے
کر رہی ہے۔ نہ جانے اس کے کہاں بے موقع لات پڑی ہے
کہ اب تک اس کا سانس پیٹ میں نہیں سمایا۔

نعیمہ : خیر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا

صالحہ: ہو تو نہیں چکا۔ ہو رہا ہے۔ لوگ بھوکے بیٹھے ہیں۔ بچہ
بھڑکے چلا جاتا ہے۔

نعیمہ : پھر اب تم کیا کہتی ہو۔

صالحہ: یہ کہتی ہوں کہ چل کر خالہ جان کے آگے ہاتھ جوڑ دو۔ اپنی خطا
معاف کراؤ۔ آپ کھانا کھاؤ اوروں کو کھلاؤ۔ بچے کو دودھ
پلاؤ۔ حمیدہ کو بلا کے گلے لگاؤ۔ اس نوکرانی بیچاری کی خیر خبر لو۔

نعیمہ : یہ اچھی کہی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ میں ہی پٹوں اور میں
ہی ہاتھ بھی جوڑوں۔ اپنا قصور ہوتا تو بھی یہ ممکن نہ تھا۔ ہاتھ تو
اب تک بندی نے نہ کسی کے آگے جوڑے اور نہ اب جوڑے جائیں
کھانا پینا تو الگ اس گھر کا نمک تک مجھ پر حرام ہے۔ خیر تمھاری
خاطر سے ننھے کو دودھ پلا دوں گی ورنہ ارادہ تو یہ تھا کہ اپنا
اور اس کا دونوں کا خون کر دوں گی

صالحہ : بی آپا! میں نہ جانتی تھی کہ تمھارا غصہ ایسا زہر میں بجھا ہوا ہے۔

نعیمہ : میرا مزاج تو سدا کا ایسا ہی ہے۔ مجھ سے کسی بات کی برداشت
نہیں ہوتی۔

صالحہ : اب تم سے کہنا سننی بیکار ہے۔ بس معلوم ہو گیا کہ تم اپنی خوشی کی ہو۔

نعیمہ : جو بات کرنے کی تھی وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دی تھی کہ بچے
کو دودھ پلا دوں گی۔

صالحہ : دودھ کہاں سے پلاؤ گی۔ کب سے بھوکی ہو۔

نعیمہ : یہ تو میں نے طے کر لیا ہے کہ اس گھر میں کچھ کھاؤں تو مردار کھاؤں

صالحہ: بغیر کھائے تو گزر ہو نہیں سکتی۔ پھر کیا کروگی ؟

نعیمہ : تم آگئیں ورنہ میں تو جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ کبھی کی چلی بھی گئی ہوتی.

صالحہ: کیا سسرال جا رہی تھیں۔

نعیمہ : سسرال جانا تو ایسا ہے کہ گڑھے سے نکلوں اور کنوئیں میں گروں۔

صالحہ: پھر کہاں جاؤگی ؟

نعیمہ : جہاں سینگ سمائیں۔

صالحہ: ایسی بات منہ سے نہ نکالنا۔ خالو جان سن لیں گے تو ناراض ہوں گے۔

نعیمہ : میں کہیں جانے کو تھوڑی کہتی ہوں۔ پڑوسن کے گھر چلی جاتی۔

صالحہ: اوّل تو وہ تمھیں گھر میں گھسنے نہ دے گی۔ اور اگر اس کی ایسی شامت آئی بھی تو کھاؤگی کہاں سے۔ اس غریب کے یہاں خود کھانے کو تو ہے نہیں۔

نعیمہ : میرا یہ پٹاری بھر ازیور کس دن کام آئے گا۔

صالحہ: واہ وا۔ گڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز۔ جن کا کھانا ان کا بنوایا ہوا زیور۔ پھر پڑوسن کا گھر دیکھو کلھیا جیسا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ بیٹے۔ بیٹیاں۔ بہوئیں۔ بچے۔ خود تو بیچاری ڈیوڑھی میں پلنگ بچھا کر سوتی ہیں۔ پھر غیر مردوں میں اٹھنا بیٹھنا تمھارے لیے مشکل نہ ہوگا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم سسرال چلی جاتیں

نعیمہ : وہ گھر تو بس چھٹ چکا۔

صالحہ : یہ تمہارا مزاج ہی تو ہے جس نے تمہارا گھر اجاڑا۔ اب یہی دیکھو کہ خالہ جان تمہارا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ ہر وقت تمہارا گھر بسنے کی دعا کرتی ہیں۔ تمہارے گھر چھوٹنے کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ سب سے زیادہ خیال تمہارا رکھتی ہیں کہ کہیں تمہارے دل کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ خالو جان اور بڑے بھائی تک کو سادہ روٹیاں ملتی ہیں مگر تمہارے دو پراٹھے کہیں نہیں گئے۔ چار پیسے روز کا سودا تمہارا بندھا ہوا تھا سو آج بھی ہے۔ حمیدہ نے ایک دن ضد کی تھی کہ میں بھی چار پیسے لوں گی تو اس کو جھڑک دیا کہ اب تو بھی بڑی بہن کی برابری کرے گی۔ آٹھویں دن مہندی۔ مہینے کے مہینے چوڑیاں بندھی ہوئی ہیں۔ لوگ ایسے کپڑے جہیز میں نہ دیتے ہوں گے جیسے تمھیں گھر میں پہننے کو ملتے ہیں۔ آج تک تمھیں بے گوٹے کا دوپٹہ بے پیک کا پائجامہ کبھی نہ پہنایا ہوگا۔ تیل، عطر، پان، پھول، مہندی، سُرمہ، مسّی، لاکھا، اُبٹنا یہی عورتوں کی چیزیں ہیں۔ سچ کہنا کبھی تمھیں ان چیزوں میں سے کسی کے مانگنے کی ضرورت پڑی ؟

خالہ جان نے اب تک کچھ چکھا بھی نہیں۔ حمیدہ سے تم اتنی خفا ہو مگر وہ صبح سے تمہارے لیے روئے جارہی ہے۔ صبح سے اب تک دانہ اڑ کر اس کے منہ میں نہیں گیا۔ نگوڑی ایسی بے سُدھ پڑی ہے جیسے جان ہی نہیں۔ ان لوگوں کا یہ حال اور تمہارا دل ذرا سی بات سے ایسا بھر گیا کہ ساری نیکی برباد۔ سارے سلوک اکارت۔ تمام احسان غارت۔ پھر بھلا تم سے کوئی کیا توقع رکھے اور کس امید پر تم سے ملے۔

نعیمہ : تمہاری یہ بات درست ہے کہ ہمیشہ سے اماں جان مجھ کو بہت

چاہتی ہیں لیکن نہ جانے اس وقت ان کو کیا ہوگیا تھا کہ بے تحاشا مار بیٹھیں۔

صالحہ: چلو یہی سمجھ لو کہ زیادتی اُن سے ہی ہوگئی۔ آخر وہ بھی تو آدمی ہی ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک زیادتی کی وجہ سے ساری زندگی کی محبّت اور ہمدردی کو بھلا دیا جائے۔ سب چیزوں پر پانی پھیر دیا جائے۔

نعیمہ: پھر اب کیا کروں۔ ان سے چل کر معافی مانگوں۔ مگر وہ منہ سے نہ بولیں تو مجھے شرمندگی ہوگی۔

صالحہ: یہ نہیں ہو سکتا کہ تمھیں معاف کردیں۔ تمھاری خطا تو بڑی ہے مگر ماں آخر ماں ہے۔ ممکن ہے تمھیں کوٹھری سے نکلتے دیکھیں اور دوڑ کر لپٹ جائیں۔

نعیمہ: میری تو باہر نکلنے کی ہمّت نہیں ہورہی۔ یہ کام کل پر کیوں نہ رکھیں۔

صالحہ: تمھیں ترس نہیں آتا کہ سارا گھر فاقے سے ہے۔ رات بھر میں تمھارا اور سب کا کیا حال ہوگا؟

نعیمہ: ہاتھ جوڑنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ اپنے نام سے کھانا منگوا بھیجو۔

صالحہ: میرا کیا ہے۔ بھوکی مروگی تم اور تمھاری ماں بہنیں۔ تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ کوٹھری سے نکلو۔ اگر میرا دل رکھنا چاہتی ہو تو اتنا تو کرنا ہی ہوگا۔

نعیمہ: چلو مجھے بچّوں کی طرح مت پھُسلاؤ۔ یہ بھی تمھاری خاطر ہے کہ مَن گئی ورنہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جاتی نعیمہ بندی کسی کی سننے والی نہ تھی۔

اس کے بعد صالحہ کوٹھری سے نکل کر خالہ کے پاس گئی۔ کچھ لوگ سو گئے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ صالحہ نے خالہ کو مبارکباد دی کہ نعیمہ من گئی تو کسی کو یقین نہ آیا۔ فہمیدہ نے حیران ہوکر پوچھا۔ "بیٹی تم نے یہ جن کیسے اُتارا؟" صالحہ نے کہا "میں تو ابھی آپا جان کو آپ کے پاس لاتی اور وہ معافی مانگتیں مگر رات زیادہ ہوگئی ہے۔ بھوک سے بُرا حال ہے۔ اور سب کو بھی جگا دیجیے۔ پھر حمیدہ کو تو اُس نے خود ہی جگا کر پوچھا کہ "بھوک لگی ہے" وہ شرمندہ ہوکر چُپ سی ہوگئی۔ صالحہ نے کہا "آؤ ہم تم کھانا کھائیں"۔ حمیدہ نے پوچھا "امّاں جان نے کھانا کھا لیا؟" صالحہ نے کہا "وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کھائیں گی" "اور ہماری آپا جان" حمیدہ نے بے تاب ہوکر پوچھا۔ صالحہ نے کہا "تم کو دنیا جہان سے کیا مطلب جسے بھوک لگے گی وہ خود کھالے گا" یہ سُن کر وہ بلک بلک کر رونے لگی اور صالحہ کی خوشامدیں کرنے لگی کہ کسی طرح آپا جان کو سمجھا کر کھانا کھلا دو۔ اس پر صالحہ نے اسے تسلّی دی۔ اس طرح کوئی ڈیڑھ گھڑی رات گئے سب لوگ کھانا کھا کر سو رہے۔

نعیمہ دو چار نوالے لے کر اُٹھ گئی۔ اب صالحہ نے پھر بات چھیڑی کہ آج ہی صفائی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ اس پر نعیمہ نے جواب دیا کہ دس پانچ دن میں صفائی بھی ہو جائے گی۔ صالحہ نے حیران ہوکر پوچھا کہ ابھی تو کہتی تھیں کہ کل پر رکھو۔ اب یہ دس پانچ دن کہاں سے آگئے۔

نعیمہ: سچ تو یہ ہے کہ اب اس گھر میں میرا گذر مشکل ہی ہے۔

صالحہ: وہ کیسے؟

نعیمہ: میں نے تمھیں بتایا تو تھا کہ اب اس گھر کے نقشے ہی اور ہیں۔

ساری رنگینیاں یہاں سے رخصت ہوئیں۔ نئے نئے قاعدے بن گئے۔ ہنسنا بولنا، کھیلنا کودنا عیب ٹھہرے۔ روزے نماز کی پابندیاں لگ گئیں۔ مجھ سے ابھی تک نماز روزے کا تقاضا تو نہیں ہوا مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ بڑے بھائی تک کا خیال نہ کیا۔ میں بیچاری تو ہوں کس گنتی میں۔ وہ اللہ رکھے اوّل تو مرد دوسرے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے۔ پھر کسی کے محتاج نہیں۔ کیسے اچھے شاعر ہیں جس رجواڑے میں جا کھڑے ہوں گے ان کی پلاؤ کی رکابی کہیں گئی نہیں۔ میں دکھیاری پردے کی بیٹھنے والی۔ ایسا کوئی ہنر نہیں آتا کہ چار پیسے کا سہارا ہو۔ اس برے دن کی کیا خبر تھی ورنہ کوئی کام کاج سیکھ لیتی۔ ماں باپ کے گھر یوں پڑی ہوں جیسے گلی میں کتا۔ اللہ واسطے کسی نے کچھ ڈال دیا تو کھا لیا نہیں تو میرا کیا زور اور کون ساحق۔ ابا جان تو پہلے ہی سے کچھ مطلب نہیں رکھتے۔ لڑکیوں سے بولنے اور بات کرنے کی ان کی عادت نہیں۔ ایک اماں جان کا سہارا تھا اب ان کا ہاتھ ایسا چھوٹا ہے کہ اللہ ہی روکے گا تو رُکے گا۔

صالحہ: آپا تم اتنی بے دل کیوں ہوتی ہو۔ گھر کا رنگ بدل رہا ہے تو اچھی ہی بات ہے۔ کوئی دن میں تم خود اس کی عادی ہو جاؤ گی۔

نعیمہ: بہن تم جانتی ہو میں تو ہنسی دل لگی کی آدمی ہوں۔ بھلا مجھ سے یہ ادنگھنی اُداس زندگی کا ہے کو نبھے گی۔ یہ جھگڑا تو آج ہوا ہے۔ میرا تو پہلے ہی سے دم گھٹا جا رہا تھا۔

صالحہ: پھر کیا کرو گی؟

نعیمہ: ایک بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کہ تمھارے گھر چلی آؤں۔

صالحہ یہ سُن کر ذرا دیر چپ رہی تو نعیمہ نے بات شروع کی۔

نعیمہ: تم تو سن کر ایسے سناٹے میں آگئیں جیسے میں تمھارے گھر آ ہی دھمکوں گی۔ ڈرومت۔ میں تو تمھارا دل دیکھ رہی تھی۔ اس سے ہزار گنی زیادہ تکلیف ہو تو بھی کسی کا احسان نہ لوں۔

صالحہ: یہ نرالی ادا تم نے سیکھی ہے کہ آپ ہی چھیڑ خانی کرتی ہو پھر آپ ہی بگڑتی ہو۔ گھر جیسے میرا ویسے تمھارا۔ جن کا گھر ہے میں ان کی بیٹی اور تم بیٹیوں سے بڑھ کر۔ جاؤگی تو اپنی خالہ کے گھر جاؤگی اور احسان اٹھاؤگی تو اپنی خالہ کا اٹھاؤگی؟

نعیمہ: اچھا یہ بولو کہ سچ مچ چلی جاؤں تو خالہ جان کیا کہیں گی۔

صالحہ: جو تمھاری اماں کہتی ہیں وہی وہ بھی کہیں گی اور وہ کیا جو سنے گا یہی کہے گا۔ کیا خالہ جان دنیا جہان سے باہر یا انوکھی ہیں؟

نعیمہ: اجی گھر سے نکال تو نہ دیں گی؟

صالحہ: یہاں کون نکال رہا ہے جو خدا نخواستہ وہاں سے کوئی نکال دے گا۔ جانے تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو۔ ایک اماں سے کیا لڑیں۔ سارے کنبے کو دشمن ٹھہرالیا۔

نعیمہ: پھر بھی خالہ جان کو تکلیف تو ہوگی۔

صالحہ: اجی، مہینے بیس روز میں تکلیف کیسی؟

نعیمہ: مہینہ بیس دن کیا۔ میں تو ساری عمر کے لیے جاتی ہوں۔

صالحہ: خدا نہ کرے کہ ساری عمر خالہ کے گھر پڑی رہو۔ اللہ تم کو اپنے گھر آباد کرے اور تمھاری ماں کا کلیجہ تم سے ٹھنڈا ہو۔

نعیمہ: میں بھی یہی سوچ کر جارہی ہوں کہ دس پانچ دن وہاں رہوں گی اس درمیان اماں جان بھی لڑائی جھگڑے کی باتیں بھول جائیں گی پھر بلوا بھیجیں گی تو چلی آؤں گی۔

صالحہ: ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں مگر خالہ جان سے اجازت لے لو۔

نعیمہ : مگر پوچھوں کیسے ؟

صالحہ : اس میں مشکل کیا ہے۔ ابھی ان کے پاس جاکر کہو کہ " میں کچھ دنوں کے لیے خالہ جان کے یہاں جانا چاہتی ہوں " وہ خوشی سے اجازت دے دیں گی۔

نعیمہ : اچھی صالحہ، اتنا کام تم ہی کر دو۔

صالحہ : نہیں میں نہیں کرتی ۔

نعیمہ : ہماری بہن ۔

صالحہ : نہیں میں بہن بھی نہیں بنتی ۔ بی بی جی کو اتنا سمجھایا۔ خاک اثر نہ ہوا ۔

نعیمہ : توبہ کوئی ایسا بے مروت ہو۔

صالحہ : تم سے بھی بڑھ کر۔

نعیمہ : اچھی میری بہن ۔

صالحہ : خیر میں پوچھ دوں گی لیکن کیا تم خالہ جان سے مل کر نہ چلو گی ۔

نعیمہ : اس وقت جیسی ہوگی دیکھی جائے گی ۔

صالحہ : سنو، بوا۔ اگر تمھارے دل میں دغا ہو تو پہلے سے کہہ دو۔ ایسا نہ ہو میں پوچھنے جاؤں بھی اور تم بے ملے چل دو۔ مجھے بیکار میں شرمندگی ہو۔

نعیمہ : میں تو تمھیں چھیڑ رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان سے ملے بغیر چل دوں ۔

صالحہ : اس وقت رات زیادہ گزر گئی ہے ۔ صبح کو خالہ جان کے ساتھ نماز پڑھوں گی ۔ اُسی وقت پوچھ دوں گی۔

نعیمہ : ڈولیوں کے لیے تو اسی وقت اڈے پر کہلا دو، کبھی صبح کو نہ ملیں۔

صالحہ : نہ ملیں گی تو ہمارے محلے سے آ جائیں گی۔

نعیمہ : اس طرح تو دیر ہو جائے گی۔
صالحہ : دیر ہو جائے گی تو کیا ہے۔ کہیں شادی میں جا رہے ہیں کہ دلہن رخصت ہو جائے گی۔
نعیمہ : منہ اندھیرے چلیں گے۔ ننھا ڈولی میں ڈرتا ہے
صالحہ : اچھا ابھی کہلا دوں گی۔

اس کے بعد نعیمہ اور صالحہ دونوں سو رہیں۔ ابھی تارے چھٹکے ہوئے تھے کہ صالحہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نعیمہ پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ نماز کے بعد صالحہ نے خالہ سے اجازت چاہی تو وہ حیران ہوئیں بولیں "کیا آگ لینے آئی تھیں کہ ابھی آئیں اور چلیں۔ ذرا نعیمہ کے مزاج کو ٹھکانے لگنے دیا ہوتا"

صالحہ : وہ بھی تو میرے ساتھ جانے کو کہتی ہیں۔
خالہ : سچ کہو۔
صالحہ : مجھ سے کہا ہے کہ آپ سے اجازت لے لوں۔
خالہ : کتنے دنوں کے لئے جا رہی ہے۔
صالحہ : یہ تو نہیں کہا۔
خالہ : خیر جا، ہی بھیج دینا۔ اور وہاں بھی سمجھاتی بجھاتی رہنا۔

اس کے بعد صالحہ نے نوکروں سے پوچھا کہ ڈولیاں کب تک آئیں گی۔ معلوم ہوا کہ ڈولیاں تو توپ چلنے سے پہلے کی دروازے پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ سُن کر صالحہ کوٹھری کی طرف چلی کہ نعیمہ کو جگائے اور یہ خوش خبری سنائے کہ اجازت مل گئی۔ وہاں جا کر دیکھا تو پلنگ خالی پڑا ہے۔ سوچی وہ بچے کا منہ دُھلاتی ہوں گی مگر پتہ چلا کہ صالحہ خالہ سے باتیں کر رہی تھی تو نعیمہ چپکے سے اٹھی اور بچے کو لے کر کھڑکی سے نکل کر بے ملے جا سوار ہوئی۔ ناچار صالحہ خالہ کو سلام کر کے

لیلی رخصت ہونے لگی تو خالہ نے کہا "اے لڑکی! ایسی کیا بھاگڑ مچی ہے۔ نعیمہ کو اٹھنے دو۔ ناشتہ کرلو تب جانا۔"

صالحہ: آپا تو چلی بھی گئیں۔

خالہ: یہ کب؟

صالحہ: جب میں آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اسی وقت چل دیں۔

خالہ: چپکے سے کیسے نکل گئی کہ میں نے دیکھا بھی نہیں۔

صالحہ: وہ کھڑکی کی طرف سے نکل گئیں۔

خالہ: جب ہی تو۔ صالحہ! دیکھا تم نے اس کا غصّہ۔ تم نے کتنا سر مارا۔ میں باہر کھڑکی تمھاری سب باتیں سُن رہی تھی۔ اثر ہوا تو یہ کہ بے ملے چل دی۔ ہے نا غضب کی بیٹی۔ اس طرح ماں سے ملے بغیر چلی جائے۔ اگر میں اس کی باتوں پر جاؤں تو جیتے جی صورت نہ دیکھوں۔ مگر کیا کروں یہ کم بخت دل مانتا ہی نہیں۔ اس مزاج کے سبب ان حالوں کو پہنچ گئی مگر اُسے ذرا خیال نہیں۔ نہ جانے اس کے مقدر میں کیا لکھا ہے۔ مجھے تو اس کے غم نے گھلا دیا۔

صالحہ: آپ رنج نہ کیجیے۔ دل کو سنبھالیے۔ اللہ نے چاہا تو دھیرے دھیرے سنبھل جائے گی۔

۹

نیمہ تو پو پھٹنے سے پہلے چپکے سے گئی مگر کلیم رات ہی کو گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ صالحہ ڈولی سے اتری تو لوگ اس سے ملنے ملانے میں لگ گئے۔ کلیم نے موقع پایا تو چپکے سے کھسک لیا۔ صالحہ نے کافی رات گئے نیمہ کو مناکر کھانا کھلایا اور سب نے بھی کھانا کھا لیا تو فہمیدہ مردانے میں آئی تو دروازے کو چوپٹ کھلا پایا۔ سمجھ گئی کہ کلیم کھسک لیا۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ صبح کو لوٹ آئے گا۔ خود کلیم بھی نکلا تو یہ ارادہ نہ تھا کہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ فہمیدہ کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ اس وقت کس سے کہے اور کیا کہے۔ کافی رات بیت چکی تھی۔ فہمیدہ نے سوچا کہ اس وقت کیا چھان بین کی جائے صبح کو دیکھا جائے گا۔

نصوح صبح کو نماز پڑھ کر لوٹا تو اسے بہت غصہ تھا کہ بیٹے کو بلوایا تو نہ آیا۔ خط لکھا تو اس کا جواب بھی نہ ملا۔ اُسے خیال آیا کہ ایک بار دو بدو بات ہو جائے۔ یہ سوچ کر وہ مردانے مکان میں آیا کہ وہ کہیں ہو تو دکھائی دے۔ نوکروں سے پوچھا مگر وہ کچھ نہ بتا سکے۔ اس پر نصوح کو بڑا غصہ آیا کہ "اپنی سمجھ سے اس کی بھلائی کرتے ہو مگر یہ اچھا نہیں کرتے۔ بات چھپانے سے نہ اسے فائدہ ہوگا اور نہ تمھیں۔ تم سب کو اس لیے رکھا ہے کہ گھر کی ٹھیک طرح دیکھ بھال کرو۔ میں تم سب کو نوکری سے الگ کر دوں گا۔"

یہ سُن کر سب کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ایک نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ "رات کو یہ مکان زنانہ رہا۔ سب کو حکم ہوا کہ

اپنے اپنے گھر جاکر سوئیں۔ جب گئے تھے تو صاحبزادے صاحب موجود تھے۔ مگر صبح کو آئے تو انھیں نہ پایا۔ اس کے بعد نصوح اندر پہنچا کہ بیوی سے دریافت کرے۔ پہلے تو اس نے پوچھا کہ ڈیوڑھی سے دو ڈولیاں کس کس کی گئیں۔ اس پر فہمیدہ نے صالحہ اور نعیمہ کی گفتگو کا ذکر کیا۔ پھر یہ بتایا کہ وہ کس طرح صالحہ سے بھی پہلے گھر سے رخصت ہو گئیں۔ پھر نصوح نے کلیم کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ بھی غائب ہیں۔

نصوح: وہ کب سے غائب ہیں؟

فہمیدہ: مغرب کے بعد میں اسے بیٹھی سمجھاتی رہی۔ اتنے میں تمھارا خط آ گیا اس کو پڑھا۔ پھر یہ ہوا کہ صالحہ کی ڈولی آ پہنچی۔ میں اس سے باتوں میں لگی۔ پھر یہ انتظار رہا کہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اب جو مردانے میں جاتی ہوں تو دروازہ چوپٹ کھلا پڑا ہے اور وہ غائب ہے۔

نصوح: چلو، اللہ کا شکر ہے۔ خس کم جہاں پاک۔ اب انصاف سے تم خود ہی بتاؤ کہ خطا میری تھی یا وہ بے بات روٹھ کر چلا گیا؟

فہمیدہ: میں خواہ مخواہ تمھاری غلطی کیسے بتا دوں۔ بالکل صاف بات ہے کہ زیادتی اسی کی تھی۔ تم نے تو زبانی کہلوایا یا خط بھیجا۔ میں تو اس سے دیر تک سر مار کے تھک گئی مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگی۔ بھلا کہیں پتھر کو جونک لگتی ہے۔ علیم نے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی شاعری کے آگے کب کسی کی سنتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بار پھر اپنی سی کر دیکھوں گی مگر اس نے موقع ہی نہ دیا۔

نصوح کو خیال آیا کہ شاید وہ جاتے ہوئے کچھ لکھ کر رکھ گیا ہو۔ اس لیے سوچا کہ اس کے سامان کی تلاشی لی جائے۔ اس کام کے لیے وہ علیم کو ساتھ لے کر مردانے میں آیا اور نوکروں سے

پوچھا کہ اس کا سامان کہاں ہے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے دو کمرے لے رکھے ہیں۔ ایک کمرہ اس کام کے لیے ہے کہ دوست آئیں تو اس میں بیٹھیں، باتیں کریں یا کھیلیں۔ اس کا نام عشرت منزل رکھا ہے۔ دوسرے میں کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان ہے۔ یہ خلوت خانہ کہلاتا ہے۔

نصوح نے پہلے عشرت منزل کو کھلوایا۔ اندر گیا تو اسے بے حد آراستہ پایا۔ کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش تھا۔ جس پر بڑے سلیقے سے چاندنی بچھی تھی۔ بیچوں بیچ ایک قیمتی قالین بچھا تھا۔ گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ سامنے اگالدان اور ایک پیچوان رکھا تھا۔ چاروں طرف کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ تھیں تو لکڑی کی مگر آئینے کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی۔ چھت میں پٹاپٹی کی گوٹ کا پنکھا لٹکا ہوا۔ اس کے اِدھر اُدھر رنگ برنگے جھاڑ، فانوس اور ہانڈیاں۔ دیواروں پر تصویریں اور دیوار گیریاں سجی تھیں

نصوح یہ سجاوٹ اور ساز و سامان دیکھ کر سکتے میں آگیا اور دیر تک افسوس کرتا رہا کہ ان فضول چیزوں میں جو روپیہ برباد کیا گیا اگر وہ محتاجوں اور غریبوں کی مدد پر صرف کیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

سامنے نظر گئی تو کیا دیکھتا ہے کہ آمنے سامنے دو میزیں لگی ہیں۔ ایک پر گنجفہ، شطرنج، چوسر، تاش اور ارگن باجے رکھے تھے دوسری پر گلدان اور عطردان کے علاوہ سنہری جلد کی ایک خوبصورت اور موٹی سی کتاب تھی۔ کھول کر دیکھا تو یہ تصویروں کا البم تھا۔ یہ تصویریں نہ تو عالموں کی تھیں نہ درویشوں کی بلکہ ایسے لوگوں کی تھیں جیسے مکھوا پکھاوجی، تان سین گوّیا، میر ناصر احمد بین نواز، صمد خاں پہلوان، کھونا بھانڈ، حیدر علی قوّال، نتھو ہیجڑا، علی محمد بھکڑ،

عدو جواری۔ اب نظر اٹھا کر ان تصویروں کو دیکھا جو دیواروں پر لگی تھیں تو انھیں اور بھی بیہودہ پایا۔ نصوح نے طیش میں انھیں توڑ تاڑ برابر کیا۔ پھر صحن میں ان کا انبار لگا کے آگ لگا دی۔

اب نوکروں کو حکم ہوا کہ "خلوت خانہ" کھولو۔ سجاوٹ کا سامان تو یہاں بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک الماری کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ اردو فارسی کی طرح طرح کی کتابیں تھیں مگر سب جھوٹی کہانیوں اور بیہودہ باتوں سے بھری ہوئی۔ جلدیں سب کی رنگش مگر اندر سے پڑھو تو ہر ایک جلا دینے کے لائق۔ سوچتا رہا کیا کروں۔ آخر وہی کیا جو بیہودہ تصویروں کے ساتھ کیا تھا یعنی سب کو تلے اوپر رکھ کے آگ لگا دی۔ یہ حال دیکھ کر اندر باہر تہلکہ پڑ گیا۔

10

اب سنیے کہ میاں کلیم گھر سے نکلے تو ان کی کیا درگت بنی۔ صالحہ ڈولی سے اُتری تو فہمیدہ اس طرف متوجہ ہو گئی۔ انھیں نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔ آنکھ بچا، بے پوچھے، بے کہے اس طرح نکل کھڑا ہوا جیسے اس گھر والوں سے کوئی ناتا ہی نہ ہو۔ ویسے

اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ آئے دن یہی کیا کرتا تھا کہ کوئی بات بُری لگی اور نکل بھاگا۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ اِدھر وہ نکلا اُدھر نوکروں کے جاسوس اس کے پیچھے لگے۔ شروع شروع میں تو یہ نوکروں کے بلانے سے ہی چلا آتا تھا۔ پھر یہ ہونے لگا کہ خود میاں نصوح جاتے اور صاحب زادے کو منا کر لاتے۔ پھر اُن کے منانے میں بھی تاثیر نہ رہی تو بی فہمیدہ کی ڈولی دربدر ماری پھرا کرتی تھی۔

اس بار بھی کلیم گھر سے نکلا تو اس بات کا یقین تھا کہ نوکر چاکر پیچھے دوڑیں گے۔ اسی امید میں اس نے اپنے دوست مرزا ظاہردار بیگ کے گھر پہنچنے تک سیکڑوں بار ہی تو پیچھے پھر پھر کر دیکھا۔ مگر یہ اس کی بھول تھی۔ اب تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اب نہ پہلی سی ماں تھی اور نہ اگلا سا باپ۔ اب بھلا نوکر کیوں دوڑنے لگے۔ کلیم سمجھ رہا تھا کہ اس بار کچھ اور ہی طرح کا بگاڑ ہے۔ نعیمہ نے کہا نہ مانا تو تھپڑ کھایا۔ سلیم اور حمیدہ کہنے پر چلے تو ماں باپ کے چہیتے ہو گئے۔ اب کی بار کلیم نے گھر سے نکل کے بڑی غلطی کی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ کلیم کے سر پر شامت سوار تھی۔ یہ شاعری کی پھٹکار تھی کہ ایک ایک شعر کی طرح اپنی ہر بات پر اپنے ہر کام پر ہر ایک کی داد اور تعریف چاہتا تھا۔ مانا کہ شاعری میں ایک درجہ رکھتا تھا۔ شعر خوب کہتا تھا، تھیدے تعریف کے قابل تھے۔ مثنوی اچھی نہ سہی مگر رباعی کا کیا کہنا۔ مقطع میں تخلص کا نباہنا آسان کام نہیں۔ یہ کمال مومن میں دیکھا یا اب ماشاء اللہ میاں کلیم ہیں۔ شہر میں سو دو سو غزلیں لوگوں کو حفظ ہیں۔ کلام کی یہ مقبولیت بس اللہ کی دین ہے۔ چھ سات برس میں اللہ نے چاہا تو

دو دیوان تیار ہو جائیں گے۔ مختصر یہ شاعری میں کلیم کی لن ترانیاں بے جا نہ تھیں مگر اور معاملوں کی سمجھ دوسری بات ہے۔

کلیم گھر سے نکلا تو مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر کی طرف ایسے مڑا جیسے گھوڑا اپنے تھان کا رُخ کرتا ہے۔ مرزا کی ظاہر داری سے وہ ایسا دھوکا کھا گیا تھا کہ اُسے ماں باپ، بھائی بہن، عزیز رشتے دار سب سے زیادہ ہمدرد اور دوست سمجھتا تھا۔ کوئی عقل مند سو بار آزما کر بھی کسی پر اس طرح بھروسہ نہیں کر سکتا جیسا یہ بے پرکھے کر بیٹھا تھا۔ کچھ لوگوں کو یہ مہارت ہوتی ہے کہ آدمی کی صورت دیکھی اور سب کچھ تاڑ لیا۔ میاں کلیم اس معاملے میں بالکل کورے تھے۔

آج کل ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر آدمی نوکری کی تلاش میں مارا پھرتا ہے اور اسے یہ گھمنڈ تھا کہ اب وارے کے نیارے ہوئے۔ اُس کے دماغ میں یہ خنّاس سمایا ہوا تھا کہ بڑے بڑے راجے مہاراجے اور نواب اور سرکاریں دور سے اس کے قدم لیں گی۔ چلا تھا جوتیاں چٹخاتا ہوا اور گمان یہ تھا کہ اب ہاتھی پر کسے سنہری ہودج میں پاؤں دھرا۔

مختصر یہ کہ کلیم شیخ چلّی کی طرح خیالی پلاؤ پکاتا ہوا اپنے دوست مرزا کے مکان پر جا پہنچا۔ ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کی لمبی تان کے سو چکے تھے۔ دروازے پر دستک دی مگر جواب نہ ملا۔ اب ذرا یہ بھی سنتے چلیے کہ یہ تھے کون ذاتِ شریف۔ مرزا کا نانا جو سگا نانا بھی نہ تھا رزیڈنٹ صاحب بہادر کی سرکار میں اردلی یا جمعدار تھا۔ جن دنوں کی یہ بات ہے ان دنوں چاروں طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی سرکار کا نوکر۔ اس نے بخشش، انعام اور رشوت سے خوب روپیہ کمایا۔ مرزا کی

ماں کم عمری میں بیوہ ہوگئی تو اس کا بوجھ اسی نے اٹھایا۔ جب تک وہ زندہ رہا ماں بیٹوں کی آرام سے کٹ گئی مگر جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے، پوتے، نواسے بہتیرے تھے وہ یہ مصیبت کیوں جھیلتے۔ انھوں نے دونوں کو چلتا کیا اور محل سرا کی برابر میں ایک جگہ رہنے کو دیدی اور سات روپے کی کرایے کی دکانیں مرزا کے نام کردیں۔

یہ حال تھا مرزا کا۔ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی۔ تین آدمی اور کُل سات روپے کی آمدنی۔ شیخی اور دکھاوا مرزا کی عادت تھی۔ یہ مسخرہ چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں پوتوں کی برابری کرے۔ وہ اسے منہ نہ لگاتے تھے مگر یہ بے حیا زبردستی ان میں گھستا۔ کسی کو ماموں جان، کسی کو بھائی جان اور کسی کو خالو جان بناتا۔ جب دیکھو پاؤں میں زری کی جوتی، سرپر دوہری بیل کی بھاری کام دار ٹوپی، بدن میں ایک چھوڑ دو دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ہلکی سی تن زیب۔ نیچے ڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں۔ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹنکی ہوئی، سرخ نیفہ۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں تک لٹکتا ہوا۔ اس میں بے تالوں کی چابیوں کا گچھا۔ مرزا صاحب یہ حلیہ بنائے چھم چھم کرتے بازار میں چلے جارہے ہیں۔

مرزا سے کلیم کی ملاقات کسی مشاعرے میں ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے اور اب تو دونوں میں بڑی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ کلیم تو خیر کسی دن مرزا کے مکان پر نہ جا سکا تھا مگر مرزا روز آتے اور سارا سارا دن اس کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنی اصلیت کلیم پر ظاہر نہ ہونے دی۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ

جمعدار کی ساری جائیداد مرزا کو ملی ہے وہ جمعدار کی محل سرائے کو مرزا کی محل سرائے، جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹوں پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔

چنانچہ کلیم گھر سے نکل کر سیدھا جمعدار کی محل سرائے کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار پکارنے اور دستک دینے پر دو لونڈیاں ہاتھ میں چراغ لیے ہوئے اندر سے نکلیں اور ان میں سے ایک نے پوچھا "کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

کلیم : ذرا مرزا کو باہر بھیج دو۔

لونڈی: کون مرزا؟

کلیم : مرزا ظاہردار بیگ۔ جن کا یہ مکان ہے۔

لونڈی: یہاں تو اس نام کا کوئی نہیں رہتا۔

اتنا کہہ کر وہ دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ کلیم نے پوچھا "کیوں جی، یہ جمعدار صاحب کی حویلی نہیں ہے؟

لونڈی: ہاں اُنھیں کی حویلی ہے۔

کلیم : ظاہردار بیگ ہی تو ان کے وارث ہیں۔

لونڈی: اُن کے وارثوں کو اللہ سلامت رکھے۔ ظاہردار بیگ ان کا وارث بننے والا کون؟

اتنے میں دوسری لونڈی بول پڑی۔ "اری کم بخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ خود کو جمعدار کا بیٹا بتاتا پھرتا ہے" پھر کلیم سے بولی "کیوں میاں! وہی نا جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی، چھوٹا قد، دُبلے پتلے، بہت بنے سنورے

پھرتے ہیں۔"

کلیم : ہاں، ہاں، وہی۔

لونڈی: تو میاں! اس مکان کے پچھواڑے اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ تو اس میں رہتے ہیں۔

کلیم کچے مکان کے پاس پہنچا اور مرزا کو آواز دی۔ ذرا دیر میں مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے تشریف لائے۔ کلیم کو دیکھا تو بہت شرمائے۔ بولے "آہا۔آپ ہیں۔ معاف کیجیے گا میں نے سمجھا کہ کوئی اور صاحب ہیں۔ اصل میں بندے کو کپڑے پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ ذرا کپڑے پہن آؤں تو ساتھ چلوں۔

کلیم : چلیے گا کہاں ؟ میں تو آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔

مرزا : اگر ذرا دیر تشریف رکھنا چاہیں تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم : مرزا! میں تو آج رات آپ ہی کے گھر گزارنے کے ارادے سے آیا ہوں۔

مرزا : ایسا ہے تو بسم اللہ۔ چلیے مسجد میں تشریف رکھیے۔ کھلی فضا ہے بڑے آرام کی جگہ ہے۔آپ چلیے۔میں ابھی حاضر ہوا۔

کلیم مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ بڑی پرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ ویران اور اجاڑ جس پر دحشت برستی ہے۔ نہ ملا، نہ حافظ، نہ طالب علم؛ نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑوں نے اس میں بسیرا کر رکھا ہے۔ سارا فرش ان کی بیٹ سے لپا پڑا ہے۔

مرزا صاحب تشریف تو لائے مگر اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ کلیم شکایت کرتا مرزا نے کہا "معاف فرمائیے گا۔ حاضر ہونے میں دیر ہو گئی۔ ان دنوں گھر میں سے علیل ہیں۔ آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اب فرمائیے

اس وقت کیسے زحمت فرمائی؟
کلیم نے گھر کے سارے حالات بیان کر دیے۔
مرزا: پھر اب کیا ارادہ ہے؟
کلیم: ایک بات تو طے ہے کہ اب گھر لوٹ جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس کے سوا آپ جو رائے دیں۔
مرزا: خیر اس وقت تو آپ آرام فرمائیے۔ صبح ہونے دیجیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ مریضہ کی دیکھ بھال اور تیمار داری کروں۔ آج اس کی حالت بہت غیر ہے۔
کلیم: یہ کیا تماشا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے میری دوہری دوہری محل سرائیں ہیں، کئی دیوان خانے، کئی پائیں باغ، حوض، حمام، کٹڑے، گنج، دکانیں اور سرائیں ہیں۔ یا تو یہ باتیں تھیں یا یہ صورت ہے کہ تم ایک اکیلے آدمی کو ٹھہرانے کا ٹھکانا بھی نہیں رکھتے۔
مرزا: بڑے تعجب کی بات ہے آپ میرے بیان کو ہوائی باتیں سمجھتے ہیں۔ اتنے دنوں سارے سارے دن کا ساتھ رہا مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ اصلیت یہ ہے کہ جمعدار صاحب مرحوم نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور اپنا وارث بنا کر مرے تھے۔ شہر کے سارے رئیسوں کو اس کا علم ہے۔ ان کے انتقال کے بعد عزیزوں نے بکھیڑا ڈال دیا۔ آپ جانتے ہیں میں جھمیلوں سے کوسوں بھاگتا ہوں۔ یہ رنگ دیکھ کر الگ ہو گیا۔ اب کسی میں اتنی لیاقت نہیں کہ جائیداد کو سنبھال سکے۔ اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے اور صلاح مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا کر

لے جائیں۔

کلیم : مگر آپ نے کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔

مرزا : ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا کیا ذکر کیا جائے۔ آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے۔ اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی دیکھ بھال کروں۔

کلیم : بہتر ہے۔ مگر پہلے ایک چراغ تو بھجوا دیجیے۔ اندھیرے کی وجہ سے طبیعت اور گھبراتی ہے۔

مرزا : چراغ کیسا میں نے تو لیمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر سوچا کہ گرمی کے دن ہیں۔ پروانے گرنے لگیں گے۔ یہاں ابابیل بہت ہیں وہ الگ ستائیں گے۔ ذرا دیر صبر کیجیے چاند نکلنے ہی والا ہے۔

کلیم گھر سے غصّے میں نکلا تھا۔ اس لیے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ اب یہ حال تھا کہ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مرزا خود ہی اس سے کھانے کو پوچھے گا مگر اس نے کھانے کا نام بھی نہ لیا اور رات بھر کے لیے رخصت ہونے لگا تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود ہی کہا "سنو یار میں نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا۔"

مرزا : سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم : تمھارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا : ارے اللہ کے بندے! پھر آتے ہی کیوں نہ کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ سب دکانیں بند ہو گئیں۔ جو دو ایک کھلی ہوں گی تو وہاں باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ ایسی چیزوں کے کھانے سے نہ کھانا بہتر۔ گھر میں آج چولھا ہی نہیں جلا۔

مگر بھوک کا برداشت کرنا بھی مشکل بات ہے ۔ خیر ایک تدبیر سوجھی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرما گرم چنے کی دال بنوالاؤں۔ بس ایک دھیلے کی ہم دونوں کو بہت ہوگی۔

ذرا دیر میں مرزا چنے بھنوا لائے۔ دھیلے کے کہہ کے گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راستے میں دو چار پھنکے لگائے۔ اس لیے کہ کلیم کے آگے دو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا : یار ہو تم بڑے خوش نصیب کہ ابھی بھاڑ گرم تھا۔ کیسے گرما گرم ہیں۔ ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔ کیسی سوندھی سوندھی خوشبو ہے۔ کتنی رات گئی۔ مگر چھدامی بھڑبھونجے کی دکان پر اس وقت بھی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ نواب صاحب کے دسترخوان پر چھدامی کے چنے بلا ناغہ ضرور موجود ہوتے ہیں۔ واقعی یہ چنے بھوننے میں کمال کرتا ہے۔ بھوننے میں انھیں کیسا سڈول بنا دیتا ہے۔ میرے سر کی قسم سچ کہنا تم نے ایسے خوبصورت چنے کبھی دیکھے ہیں۔ کیسی پیاری پیاری رنگت ہے کوئی بسنتی ہے، کوئی پستئی۔ کیسے کیسے غلے اور پھول زمین سے اُگتے ہیں مگر چنے کی لذّت کو کوئی نہیں پہنچتا۔ اس کے بارے میں کسی نے بڑے مزے کی کہانی گھڑی ہے۔ سنی ہے؟

کلیم : نہیں تو، سنائیے۔

مرزا : تم جانتے ہی ہوگے کہ میکائیل ایک فرشتے کا نام ہے جس کا کام اللہ کی مخلوق کو رزق پہنچانا ہے۔

کلیم : ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

مرزا : چنا ایک دن حضرت میکائیل کی خدمت میں فریاد لے کر گیا کہ

"حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ ہیں نے سرزمین سے نکالا اور مصیبتوں کا نشانہ بننے لگا۔ میری کونپلیں نکلیں اور لوگوں نے ساگ بنایا۔ کتنے تو ایسے بے درد ہیں کہ مجھے کچّا کھا جاتے ہیں۔ ذرا ہوش سنبھالا تو آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں، ہُولے بناتے ہیں۔ پک گیا تو شاخیں اور پتّیاں بھُس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے پیٹ کا ایندھن بنائی گئیں۔ میرا دانہ دَلا جائے، گھوڑوں کو کھلایا جائے، بھاڑ میں بھونا جائے، بیسن بنایا جائے، کھولتے پانی میں اُبالا جائے، گھنگنیاں بنائی جائیں۔ غرض کون سی آفت ہے جو مجھ پر نہیں توڑی جاتی۔

حضرت میکائیل کے دربار میں چنے کا اس طرح چرڑ پڑ بولنا سب حاضرینِ دربار کو ناگوار ہوا۔ ہر شخص بگڑا اور اسے کھانے کو دوڑا۔ یہ رنگ دیکھا تو چنا بھی فیصلہ سُنے بغیر کھسک لیا۔

تو جناب یہ چنے ایسے لذّت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کو بھی انھیں کھانے کی حسرت ہو۔ اس وقت نمک مرچ مہیّا نہیں ہو سکتا ورنہ میر مدّد کے کبابوں میں یہ لذّت اور سوندھاپن کہاں۔

اس طرح مرزا نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے چنوں کو گھی میں تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اُسے بھی یہ چنے ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی مزے دار لگے۔

اس کے بعد مرزا نے گھر جا کر ایک پھٹی سی دری اور ایک مَیلا سا تکیہ کلیم کے لیے بھیج دیا۔ کلیم کی حالت اس وقت دیکھنے کے لائق تھی۔ یا تو عشرت منزل اور خلوت خانہ میں قیام تھا یا رات کاٹنے کو یہ جگہ اور بستر نصیب ہوا۔ نہ چارپائی، نہ چراغ! بزرگ سچ ہی کہتے ہیں کھانے کو لات نہ مارنی چاہیے۔ طیش میں کھانا

چھوڑ کے نکلا تو مٹھی بھر چنوں پر گذر کرنی پڑی ۔ نہ بہن، نہ بھائی، نہ کوئی دوست ہمدرد، نہ نوکر، نہ خدمت گار ۔ کوئی اور ہوتا تو اس سے سبق لیتا ۔ اپنی حرکت سے باز آجاتا اور جا کر باپ سے معافی مانگتا مگر کلیم کو تو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے ۔ اس نے راتوں رات ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں کہی ۔

گھڑی بھر رات رہی تو آنکھ لگ گئی ۔ اس میں کوئی اٹھائی گیرا ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ دری لے کر چمپت ہوا ۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ فرش پر پڑا ہے ۔ سوتے میں کروٹیں لینے سے سیر دل گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا لیپ جسم پر تھپا ہوا ہے ۔ حیران ہو کر دیکھا کہ راتوں رات آدمی سے بھتنا کیسے بن گیا ۔ مسجد میں پانی بھی میسّر نہ تھا ۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ آجائے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں ۔

دوپہر میں ایک لڑکا کھیلتا ہوا اُدھر آنکلا ۔ کلیم اسے بلانے کو لپکا ۔ اس لڑکے نے اس کی صورت دیکھی تو ڈر کے بھاگا ۔ خدا جانے اسے بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا ۔ کلیم نے بہتیرا پکارا مگر اس نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا ۔ بڑی مصیبت اور ددفاقوں سے کلیم نے شام پکڑی ۔ ذرا اندھیرا ہوا تو الّو کی طرح نکلا اور سیدھا مرزا کے گھر پہنچا ۔ آواز دی تو جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں ۔

کلیم نے سوچا اپنا تعارف کرادے اور ہاتھ منہ دھونے کو پانی مانگے ۔ پھر مرزا کی پھٹی پرانی ٹوپی جوتی لے لے تاکہ گلی کوچے میں چلنے کے قابل تو ہو جائے ۔ یہ سوچ کر بولا "کیوں حضرت آپ

مجھے جانتی ہیں؟" اندر سے جواب ملا" ہم تمھاری آواز تو پہچانتے نہیں۔ نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔"

کلیم: میرا نام کلیم ہے۔ مرزا ظاہر دار بیگ سے میری بڑی دوستی ہے۔ رات میں مرزا کا ہی مہمان تھا اور مسجد میں سو رہا تھا کہ...."

اندر سے آواز آئی "وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات کو تمھارے لیے بھیجا گیا تھا" دری اور تکیے کا نام سن کر تو کلیم سنّاٹے میں آگیا۔ ابھی جواب دے بھی نہ پایا تھا کہ اندر سے آواز آئی۔ "مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر دری تکیہ تو اس سے لے لو"

یہ سن کر تو کلیم سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک بھی نہ پہنچا تھا کہ مرزا زبردست نے" چور چور" کر کے جا لیا۔ کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کی دوستی کا بہت واسطہ دیا مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کے کوتوالی لے گیا۔

کوتوال نے کلیم سے نام پتہ پوچھا۔ کلیم کو بتاتے شرم تو آتی تھی مگر اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس وقت کلیم کا حلیہ ایسا تھا کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ "میاں نصوح کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں ان کے بڑے بیٹے کا نام بھی یہی ہے جو تم بتاتے ہو۔ مگر کلیم تو ایک مشہور شاعر ہے اور تمھاری حیثیت یہ ہے کہ ننگے سر، ننگے پاؤں، بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ رات بھر تو تمھیں حوالات میں رہنا ہوگا۔ جھوٹ سچ کی بات تو صبح کو میاں نصوح سے معلوم ہو سکے گی۔"

کلیم یہ سن کر رو دیا۔ بولا "میں وہی بدنصیب ہوں جس کی

شاعری کا چرچا آپ نے سنا ہے۔ یقین نہ ہو تو میں اپنا تازہ کلام آپ کو سناؤں۔"

کل رات مرزا اور مسجد کی شان میں جو کچھ کلیم نے کہا تھا وہ کوتوال کو سنایا۔ اس نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کر دیے کہ انھیں میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ انھیں اپنا بیٹا بتائیں تو چھوڑ دینا۔ نہیں تو حوالات میں بند کر دینا۔

ایسی حالت میں باپ کے سامنے جانا کلیم کو کتنا ناگوار گزرا ہوگا مگر سپاہی اسے کھینچ کر لے ہی گئے۔ محلّے کی جس مسجد میں نصوح نماز پڑھتا تھا وہ گھر سے قریب ہی تھی۔ نماز کے بعد کافی رات تک وہ مسجد کے صحن میں بیٹھا لوگوں سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ نصوح ابھی وہیں بیٹھا ہوا تھا کہ کوتوالی کے سپاہی کلیم کو لیے آ پہنچے۔

جن لوگوں کو کلیم ذلیل سمجھتا تھا۔ قلا وزی، مُردہ شو، بھک منگے اور ٹکڑ گدا بتاتا تھا آج انھیں کے سامنے وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ نہ سر پر ٹوپی تھی، نہ پیر میں جوتی، دو وقت کے فاقے سے ذرا سا منہ نکل آیا تھا، ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا حال یہ تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہونا بہتر۔

نصوح نے اس حالت میں بیٹے کو دیکھا تو کلیجے میں ایک تیر سا لگا۔ اگر پہلا سا نصوح ہوتا تو شاید عورتوں کی طرح داڑھیں مار کر رونے لگتا، دوڑ کر بیٹے سے لپٹ جاتا یا سپاہیوں سے الجھ پڑتا۔ مگر اب تو نصوح صبر و شکر کا پُتلا تھا۔ اس نے ایک آہ بھری اور سر جھکا لیا۔ جب سپاہیوں نے اس سے کلیم کے بارے میں پوچھا تو اس نے آنکھیں نیچی کیے جواب دیا "جب حضرت نوح اپنے بیٹے کو ڈوبتے دم تک بیٹا بیٹا پکارتے رہے تو میں اس کے

بیٹے ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں" یہ جواب سُن کر سپاہی تو لوٹ گئے اور حاضرین میں سے کسی نے کلیم کا ہاتھ پکڑ کے پاس بٹھا لیا۔

ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد نصوح نے کلیم سے گھر چھوڑ کر چلے جانے کا سبب پوچھا۔ پھر بہت دیر تک وہ اسے سمجھاتا رہا کہ س نے جتنی کوششیں کیں وہ سب خود کلیم کی بھلائی کے لیے تھیں۔ جتنی دیر نصوح بولتا رہا کلیم خاموش سنتا رہا۔ نصوح اپنی بات پوری کر چکا تب بھی کلیم چُپ رہا۔ آخر جھنجلا کر نصوح نے پوچھا کہ "کچھ اپنے دل کا حال تم بھی تو ظاہر کرو" اس پر کلیم بولا تو یہ کہ "مجھے اجازت دیجیے کہ اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں گھر سے منگا لوں"

یہ جواب سُن کر نصوح کو بہت صدمہ ہوا۔ اس نے کہا "تم اس گھر کو میرا کیوں سمجھتے ہو۔ اس میں زیادہ دنوں تک تمھیں کو رہنا ہے۔ تمھاری ماں بڑی بے چین ہے۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب پریشان ہیں۔ تم میرے قصور کی سزا انھیں کیوں دیتے ہو؟"

کلیم: پچھلے کچھ دنوں سے آپ کا مزاج اور طور طریقہ بالکل بدل گیا ہے۔ نئے نئے قاعدے جاری ہوئے ہیں۔ ان کی مخالفت کر کے کوئی گھر میں رہ نہیں سکتا۔ میں نے بہت چاہا کہ مجھے آپ کے سامنے کچھ نہ کہنا پڑے۔ ویسے میں اس طریقے کے خلاف ہوں اور اسی لیے بلانے پر آپ کے پاس نہ آیا تھا۔ اوروں کی بات تو الگ ہے لیکن میں اس گھر سے دور رہ کر اپنی پسند کی زندگی گزار سکتا ہوں۔ اس وقت میرا یہ کہنا عجب سا لگتا ہے کیونکہ میری حالت ہی ایسی ہے۔ لیکن ذرا دلی سے نکل جاؤں پھر آپ کو دکھا دوں گا کہ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ وطن میں آدمی کی قدر نہیں ہوتی

یہ سُن کر نصوح اٹھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کسی طرح کلیم کو گھر

لے جائے۔ کلیم بھی نصوح کے ارادے کو تاڑ گیا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور بھاگ لیا۔ نصوح ہکّا بکّا رہ گیا مگر کر کیا سکتا تھا۔

کلیم نہ گھر میں جا سکا نہ گھر سے کوئی چیز لینی نصیب ہوئی۔ جیسا آیا تھا ویسے ہی الٹے پاؤں پھر گیا۔ اندر یہ خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ فہمیدہ باولوں کی طرح دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ قریب تھا کہ بیقرار ہوکر باہر نکل جائے۔ اتنے میں نصوح آگیا اور پوچھنے لگا۔ "خیر تو ہے یہاں کہاں کھڑی ہو؟"

فہمیدہ نے میاں کو دیکھا تو دل قابو سے باہر ہو گیا۔ بلکنے لگی۔ پوچھا "میرا کلیم کہاں ہے؟"

نصوح: کلیم تمھارا یا میرا ہوتا تو گھر کے اندر ہوتا۔ اتنے سمجھانے پر بھی وہ نہ آیا۔

فہمیدہ: خدا کے لیے ذرا مجھے اس کی صورت تو دکھا دو سنا ہے نہ سر پہ ٹوپی ہے نہ پیر میں جوتی۔ کپڑوں کی بُری حالت ہے۔ وہ موئے سپاہی کون تھے میرے بچوں کو پکڑنے والے۔ گھورا ہو تو الٰہی دیدے پھوٹیں۔ ہاتھ لگایا ہو تو خدا کرے پور پور سے کوڑھ ٹپکے۔ وارے تھے وہ سپاہی اور قربان کیا تھا وہ کوتوال۔ میرا بچہ اور چور؟ یہ تو بتاؤ وہ گیا کہاں؟

نصوح: مجھے کیا خبر کہاں گیا۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس کی وجہ سے سارے شہر میں میری رسوائی ہوئی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ یا تو خدا اسے نیک ہدایت دے یا، میں اس کو تو کیا بد دعا دوں، خدا مجھے اٹھا لے۔ ان تکلیفوں سے چھٹکارا تو ملے۔

فہمیدہ: تم نے بیٹے کو اس حالت میں کن آنکھوں سے دیکھا؟ کیسے صبر

کیا؟

نصوح: جیسے اس کی گستاخی پر صبر کیا تھا کہ میں نے بار بار بلایا اور وہ نہ آیا۔ اسی طرح اس کی حالت پر بھی صبر کر لیا۔ جن آنکھوں نے اس کا خلوت خانہ اور عشرت منزل دیکھی تھی انھیں آنکھوں نے اسے کھلے سر، ننگے پاؤں، چور بنا ہوا سپاہیوں کی حراست میں دیکھ لیا۔

فہمیدہ: تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ اُسے مجھ تک لے آتے؟

نصوح: تم اُسے مجھ تک نہ لا سکیں تو سوچو کہ میں اسے تم تک کیسے لاتا؟

فہمیدہ: کہاں تم مرد، کہاں میں عورت۔

نصوح: تم سمجھتی ہو میں اس سے کشتی لڑتا۔

غرض نصوح سمجھا بجھا کر بیوی کو گھر میں لے گیا اور یہ بات اس کے دل میں بٹھا دی کہ اس کے لیے رونا دھونا بیکار ہے اس کے لیے بس دعا کرنی چاہیے۔

ادھر کلیم نے خالہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا اور واقعی وہ وہاں پہنچ جاتا تو اُس گھر کا پاکیزہ ماحول اس کی طبیعت اور عادت مزاج پر خوشگوار اثر ڈالتا مگر اُس گھر میں قدم رکھنا کلیم کی قسمت میں نہ تھا۔ بہت سی گردشیں ابھی اس کی تاک میں تھیں۔

کلیم گلی سے نکلا ہی تھا کہ میاں فطرت سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ حضرت نصوح کے چچازاد بھائیوں میں سے تھے۔ جائیداد کے پیچھے خاندانی عداوت تو عام بات ہے ہی انھیں کبھی نصوح سے اللہ واسطے کا بغض تھا۔ رشتہ داری کی وجہ سے ایک کے حالات دوسرے سے چھپے ہوئے نہ تھے۔ فطرت نے سُن لیا تھا کہ نصوح کے گھر میں اُتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چاہے سب نصوح کے سمجھانے میں

آجائیں مگر کلیم کو جونک لگنے والی نہیں ۔ کلیم راستے میں فطرت سے ٹکرا گیا تو اس نے اور زخموں پر نمک چھڑکا، جلتی آگ میں تیل ڈالا۔

فطرت: میاں کلیم! تم تو خاندان کی ناک ہو۔ کیسے لائق اور کیسے نیک۔ نصوح کی بدمزاجیوں نے کنبے میں پھوٹ ڈالی۔ ہمیں غیر بنایا، میل ملاپ چھڑایا۔ شاباش ہے کہ تم نے ایسے بے مروّت آدمی سے اب تک نباہ کیا۔ اب کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟

کلیم: خالہ جان کے گھر جانے کا ارادہ ہے۔

فطرت: وہ لوگ بھی تمھارے باپ کی بدمزاجی سے واقف ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمھیں گھر میں نہ گھسنے دیں گے۔

کلیم: ان لوگوں سے ایسی امید تو نہیں۔

فطرت: اجی تمھارے باپ ایسے ذاتِ شریف ہیں کہ تمھیں نکالنے کو خود وہاں جا پہنچیں گے۔ اس میں تمھاری بڑی کرکری ہوگی۔

کلیم: ہاں اس کا ڈر تو ضرور ہے۔

فطرت: میاں تم سمجھو تو ہم بھی تمھارے اپنے ہی ہیں۔ تمھارا جو درد ہمیں ہوگا وہ خالہ خالو کو نہیں ہو سکتا۔ بھائی نصوح بیمار پڑے تو اللہ گواہ ہے میں دونوں وقت محلّے میں جاکر خیریت کی خبر پوچھتا تھا۔ ہماری امّاں حلال خوری سے برابر تمھارے گھر کے حالات پوچھا کرتی ہیں۔ میری مانو تو اس وقت تم میرے ساتھ چلے چلو۔

غرض میاں فطرت للو پتّو کرکے کلیم کو اپنے گھر لے گئے اور نصوح کی جلن سے اس کی ایسی خاطر مدارات کی کہ گھر والے بھی کیا کرتے۔ اب تو کلیم کو اس سے بڑا ہمدرد کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اب تک تو اسے صرف باپ کی رائے سے اختلاف تھا

اب اس سے دشمنی ہوگئی ۔ یہ خیال دل میں بیٹھ گیا کہ روزے نماز کا تو صرف بہانہ تھا وہ تو اُسے نکما سمجھ کے گھر سے نکالنا چاہتا تھا ۔

کلیم، میاں فطرت سے شیر و شکر ہوگیا۔ وہ یہاں خوش تھا مگر وقت کاٹے نہ کٹتا تھا ۔ اسے اپنی کتابیں یاد آتی تھیں ۔اس نے فطرت سے مشورہ کیا کہ کسی طرح میری کتابیں یہاں آجائیں ۔ میاں فطرت بولے "کتابیں تو چیز ہی کیا ہیں کہو تو میاں نصوح کی چارپائی اٹھوا منگاؤں" آخر طے پایا کہ فطرت کلیم کی ماں کے پاس جائے اور کتابیں لے آئے ۔

وہ وہاں پہنچا تو خلوت خانہ اور عشرت منزل کی تباہی اور کتابوں کے جلنے کا حال سنا ۔ اس نے نون مرچ لگا کر یہ قصہ کلیم کو سنایا ۔ اس پر سنتے ہی بجلی گری ۔ ایسا تاؤ میں آیا کہ کوئی جلی کٹی بات نہ تھی جو نصوح کو نہ سنائی ہو مگر کیا کرتا لال پیلا ہو کے چپ ہو رہا اور باپ سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچنے لگا ۔ بہت سی بیہودہ باتیں اس کی سمجھ میں آئیں ۔ مگر فطرت نے کہا" میاں تم نرے صاحبزادے ہو۔ میں ایسی ترکیب بتاؤں کہ بدلہ بھی نکل جائے اور تم مالا مال بھی ہو جاؤ ۔

کلیم : وہ کیا ؟
فطرت: گاؤں پر تمھارا نام چڑھا ہوا ہے ۔ اس کا دعویٰ کردو۔
کلیم : یہ خیال بیکار ہے ۔ گاؤں پر ان کا قبضہ ہے
فطرت: تمھارا قبضہ ہوتے کیا دیر لگتی ہے ۔
کلیم : ناممکن ۔
فطرت: جب ایسی آسان بات کو تم ناممکن بتاتے ہو تو اور تم سے کیا

ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی تھے تو گھر سے نہ نکلتے۔ اگر گاؤں میرے
نام ہوتا تو دکھاتا۔

کلیم : سمجھ لو کر تمھارے ہی نام ہے۔

فطرت: سمجھ کیسے لوں۔ تم فرضی بیع نامہ میرے نام کر دو۔ پھر دیکھو۔

کلیم : اجی آپ کہیں تو ساری دنیا آپ کے نام لکھ دوں۔

فطرت: بولو کس قیمت پر بیع نامہ کرو گے؟

کلیم : کسی فرضی قیمت پر۔

فطرت: پھر بھی کتنی قیمت پر۔

کلیم : سو روپے پر۔

فطرت: مجھ سے ہزار نقد لیجیے۔

کلیم : سچ؟

فطرت: اور کیا

کلیم : واللہ بیچا

فطرت: واللہ لیا

کلیم سمجھ رہا تھا کہ سب ہنسی مذاق ہے۔ مگر فطرت نے گھر میں سے ہزار روپے کا توڑا لا کے سامنے رکھ دیا۔ بات کی بات میں بیع نامہ تیار ہوگیا۔ مگر کلیم کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ فطرت روپے واپس نہ مانگ لے۔ اس لیے وہ توڑا بغل میں دبا کے وہاں سے چل دیا۔ چاندنی چوک میں محل دار نماں کا کمرہ اسی دن خالی ہوا تھا۔ اس نے وہ کمرہ حاصل کرلیا۔ دہلی جیسا شہر اور کلیم جیسا فضول خرچ۔ پھر مفت کا مال۔ پلک جھپکتے کمرہ سج سجا لیا۔ نوکر چاکر سازوسامان سب کچھ جمع ہوگیا۔ مشاعرہ ہوا۔ ناچ کی محفل جمی۔ پھر بے فکرے اور نکمے اکٹھے ہو گئے۔ حد یہ ہے کہ بے غیرت مرزا ظاہر دار بیگ نے سنا تو

وہ بھی دوڑے چلے آئے اور کلیم ایسا احمق کہ اس کا دل پھر صاف ہوگیا۔

دو مہینے خوب اللّے تللّے رہے۔ تیسرا مہینہ شروع ہوا ہی تھا کہ ہزار روپے تمام ہوئے۔ ادھار دینے والے چاروں طرف سے دوڑے۔ گھر کا سارا سامان بک گیا۔ اب آنکھ کھلی مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ کوئی راستہ سجھائی نہ دیا تو کلیم پہر رات گئے نوکر کا بھیس بدل کے گھر سے نکلا مگر دیوانی کے کارندوں نے گرفتار کر لیا۔

اگلے دن عدالت میں پیشی ہوا۔ کچہری میں نصوح سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ بڑی مصیبتیں جھیل چکا تھا۔ اب باپ کو دیکھا تو بے اختیار رو دیا۔ مگر زبان سے کچھ کہہ نہ سکا۔ نصوح بیچارہ اس گاؤں کے جھگڑے میں آیا تھا جس کا بیع نامہ کلیم نے فطرت کے نام کر دیا تھا۔ فطرت بلا کا فطرتی تھا۔ اس نے ایسے داؤں پیچ کیے کہ گاؤں نصوح کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس بار باپ بیٹے کی ملاقات اس طرح ہوئی کہ بات چیت تو دور کی بات ہے سلام دعا بھی نہ ہوئی۔ لیکن ایک دوسرے کا حال معلوم ہوگیا۔ ابھی نصوح نے کچہری کی چار دیواری سے باہر پاؤں نہ رکھا تھا کہ کلیم جیل خانے میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنی شاعری کے واسطے دیے مگر عدالت نے ایک نہ سنی۔

کلیم اگلے ہی دن چیں بول گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے بے غیرتی کا ٹھیکرا آنکھوں پر رکھ کر باپ کو خط لکھا کہ اپنی گستاخی اور بے حیائی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں نے جیسا کیا ویسا پایا بلکہ کیا ایک من تو بھگتا ایک چھٹانک۔ اب اللہ کے غضب سے ڈرتا ہوں

مگر وہ معاف کرنے والا ہے ۔ شاید بخش دے ۔ سنا ہے کہ توبہ ربڑ ہے اور گناہ پنسل سے لکھی ہوئی تحریر ۔ اب مصیبت یہ ہے کہ سات سو روپے کے عوض مصیبت میں پھنسا ہوں ۔ صدقہ زکوٰۃ، خیرات جان کر نہ دیں تو قرض حسنہ سمجھ کر دے دیجیے ۔ قیدی کے چھڑانے اور غلام کے آزاد کرانے کے ثواب سے آپ سے زیادہ کون واقف ہوگا ۔

یہ خط باپ کے پاس پہنچا تو اس نے ذرا بھی سوچ بچار سے کام نہ لیا اور کھڑے کھڑے سات سو روپے گن دیے ۔ کلیم اس مرتبہ بھی باپ سے نہ چوکا ۔ ضرورت تو تھی پانچ سو کی اور منگائے سات سو ۔ باقی بچے دو سو ۔ اس رقم سے سفر کا سامان درست کیا اور دولت آباد کا راستہ لیا ۔

۱۱

نوکری کی تلاش میں کلیم دولت آباد پہنچ گیا ۔ یہ ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست ہے ۔ پانچ چھ لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی تھی ایک نوجوان اور ناتجربے کار مسند نشین ہوا تو چاپلوسوں اور خود غرضوں نے آگھیرا ۔ نتیجہ یہ کہ دولت آباد چھوٹا سا لکھنؤ بن گیا ۔

یہ خبر کلیم کو ملی تو وہ بھی یہاں آنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ آخر دولت آباد پہنچا اور سرائے میں اتر کے امیری ٹھاٹھ لگا لیے۔ رئیس کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور اسے لے کر درِ دولت پر جاکر حاضری دی۔

کلیم کو پتہ نہ تھا۔ یہاں کے حالات بالکل بدل چکے تھے۔ رزیڈنٹ کو ریاست کی بدنظمی کی خبریں پہنچیں تو وہ خود دولت آباد پہنچے۔ رئیس کے سارے اختیارات چھین لیے گئے اور ریاست کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوا۔ ریاست کے ہمدرد اور پرانے نمک خوار اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انتظام الدولہ مدبر الملک نواب بیدار دل خاں کو انتظام کا بڑا سلیقہ تھا۔ اور یہ رئیس کے ماموں بھی تھے۔ انھیں صدر اعظم مقرر کیا گیا۔ رئیس کے خرچ کے لیے ایک رقم مقرر کر دی گئی۔ خود غرض اور خوشامدی مصاحب ایک ایک کر کے نکال دیے گئے۔

غرض یہ کہ کلیم جس چاٹ پر دوڑا آیا تھا اب وہ باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس بے چارے کو اس انقلاب کی کیا خبر تھی۔ اس نے پہنچ کے اطلاع کرائی۔ اندر سے بلاوا آگیا۔ خوشی خوشی اندر گیا کہ ٹیڑھے بانکے، رنگیلے، سجیلے لوگوں سے ملاقات ہوگی مگر وہاں جا کے دیکھا تو لمبی لمبی داڑھیوں والے مولوی بڑی بڑی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی رجسٹر کھولے بیٹھا ہے۔ کوئی کتاب دیکھ رہا ہے۔ کوئی درس دے رہا ہے۔ یہ رنگ دیکھتے ہی کلیم نے کہا:۔

جاتے تھے جستجوئے بت خانہ وصنم میں
بھٹکے تو جا کے نکلے ہم بھی کہاں حرم میں

مولویوں کو دیکھ کے پہلے تو کلیم کے جی میں آئی کہ بھاگ لے۔ پھر سوچا ذرا حال تو دریافت کریں۔ ایک صاحب کے قریب جاکر

اس نے کہا " مجرا عرض کرتا ہوں " مجرا کا لفظ سُن کر ان حضرت کے کان کھڑے ہوئے اور وہ عینک اتار کے اسے دیکھنے لگے۔ کلیم دُہرا ہوکر آداب بجالایا۔ اس بزرگ نے فرمایا " وعلیکم السلام ورحمۃ اللہِ وبَرَکاتہٗ " اس کے بعد آنے کا سبب پوچھا۔اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ مولوی صاحب نے وہاں کے حالات سے مختصر طور پر کلیم کو باخبر کیا اور بتایا کہ رئیس کو کوئی اختیار نہیں۔ سارے اختیارات صدر اعظم کو حاصل ہیں۔

وہاں سے کلیم صدرِ اعظم کی خدمت میں پہنچا۔ یہ صاحب کلیم کو کچھ بچے نہیں۔ صدر اعظم کسی مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے۔اس سے نمٹ کر کلیم سے مخاطب ہوئے۔ اس نے یہاں آنے کا مقصد بیان کیا۔ صدر اعظم نے فرمایا کہ شعر و شاعری کا یہاں گزر نہیں۔کلیم نے اپنے شاعرانہ کمالات کا تفصیل سے ذکر کیا مگر ان صاحب کی نظر میں یہ ساری خوبیاں بے مصرف تھیں۔ وہاں فوجداری کی ایک ملازمت ضرور موجود تھی مگر بھلا وہ کلیم کے کس کام کی۔

اس دن تو کلیم مایوس لوٹ آیا اور سوچتا رہا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ گزر بسر کا کوئی ذریعہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آخر وہ دن آگیا جب فوجداری کی نوکری کا انتخاب ہونے والا تھا۔ یکایک نہ جانے کلیم کے ذہن میں کیا آیا کہ سپاہیانہ لباس پہن، مونچھوں کو تاؤ دے کر خدمتِ فوجداری کا امیدوار بن کر کمیٹی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آدمی تھا ڈیل ڈول کا اور باتونی الگ۔ ایک دم فوج میں کپتان مقرر ہوگیا۔

اب تو یہ شان تھی کہ جب دیکھو اردلی میں دس پندرہ سوار شہر میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے۔ دہلی میں دوستوں کے پاس

صبح شام کپتان صاحب کے خط آتے تھے۔ باپ کو چھیڑنا جو ٹھہرا۔ اتنے میں یہ ہوا کہ ایک ٹھاکر زور آور سنگھ نے اپنے علاقے کی قسط دینے سے انکار کر دیا۔ اس کی سرکوبی کے لیے دولت آباد سے ایک فوج روانہ ہوئی۔ اس میں کلیم بھی شامل تھا۔ اٹھتی جوانی تھی اور نئی نئی نوکری۔ مزاج میں بے باکی تھی۔ پہلے ہی حملے میں کلیم زخمی ہوگیا۔ گھٹنے کی چپنی پر گولی بیٹھی تو اندر ہی اندر ران تک تیر گئی۔ نہ جانے اللہ تعالیٰ نے نسوں میں کس طرح کا تعلق رکھا ہے کہ ایک ٹانگ کے زخمی ہونے سے سارے کا سارا دھڑ بیکار ہوگیا۔

کلیم زخمی ہوکر ہسپتال میں داخل ہوا۔ وہاں ایک ٹانگ کاٹ دی گئی۔ یہ بیچارہ نازوں کا پلا تھا یہ دکھ نہ جھیل پایا۔ حالت ردّی ہوتی چلی گئی۔ اتنا بڑا ڈھوجوان ایک ہی مہینے میں گھل گھل کر پلنگ کو لگ گیا۔ جینے کی آس نہ رہی تو صدر اعظم نے ترس کھاکر دہلی بھیجنے کا بندوبست کیا۔ دولت آباد سے دہلی تک کہاروں کی ڈاک بیٹھ گئی۔

جب کہاروں نے اس کی ڈولی نصوح کے دروازے پر جا اتاری تو نصوح بے سدھ پڑا تھا۔ اندر خبر ہوئی تو فہمیدہ بیتاب ہوکر بے پردہ باہر نکل آئی۔ پالکی کے پٹ کھول کے دیکھا تو بیٹا بے سدھ پڑا تھا۔ چہرے پہ مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس طرح بلک بلک کے روئی کہ دیکھنے والوں کے کلیجے پھٹ گئے۔ فہمیدہ کی آواز سن کے نصوح بھی نیچے اترا۔ بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بڑی مشکل سے اس نے فہمیدہ کو ڈھارس بندھائی۔

دونوں میاں بیوی نے صلاح کرکے یہ بات ٹھہرائی کہ اسے

نعیمہ کے گھر لے چلیں ۔ سرکاری شفا خانہ بھی وہاں سے قریب ہے اور میاں عیسیٰ جو ہندوستانی جراحوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے دیوار بیچ ان کا گھر ہے ۔ کیسا سامان اور کس کی تیاری ۔ گھر کا گھر کلیم کی پالکی کے پیچھے پیچھے ہو لیا ۔ یہاں سے کوئی چھ سات پیسے ڈولی نعیمہ کی سسرال تھی کہاروں نے پالکی اٹھائی تو کہیں کاندھا تک نہیں بدلا ۔

نعیمہ کو جلد ہی ہوش آگیا ۔ اس نے ماں باپ سے اپنی خطا معاف کرائی اور اپنی سسرال چلی گئی ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے نعیمہ کا گھر پھر سے آباد کیا ۔

12

نصوح کے گھر میں صرف دو ایسے تھے جن کی عادتیں پکی ہو چکی تھیں ۔ یہ تھے کلیم اور نعیمہ ۔ پھر بھی دونوں میں فرق تھا ۔ کلیم فولاد تھا تو نعیمہ اس کے مقابلے میں سیسہ بلکہ یوں کہیے کہ رانگا جس کا پگھلانا اتنا مشکل نہیں جتنا فولاد کا ۔ نعیمہ عورت، نرم دل اور پردے میں رہنے والی ۔ کلیم مرد، سخت دل، باہر کا چلنے پھرنے والا ، سیکڑوں سے ملاقات ، ہزاروں سے جان پہچان ۔

اس لیے کلیم کے دل کو ذاتی روگ کے علاوہ سیکڑوں بیماریاں ایسی تھیں جنھیں چھوت کی بیماریاں کہنا چاہیے جو ایک سے اڑ کر دوسرے کو لگتی ہیں۔ بُری صحبتوں میں بیٹھ اٹھ کر اس نے نہ جانے کتنے روگ لگا لیے تھے۔

نعیمہ میں جو کچھ برائی تھی وہ نادانی اور ماں باپ کے لاڈ پیار کی وجہ سے تھی۔ ویسے تھی وہ بھولی بھالی اور دل کی بودی۔ کلیم کا معاملہ الٹا تھا۔ یار دوستوں نے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ سیکڑوں بری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ پہروں چڑھے سو کر اٹھنا، پھر گھنٹوں آئینہ سامنے رکھے بناؤ سنگار کیے جانا، طرح طرح سے مانگ نکال نکال کر دیکھنا۔ بال ترشوانے کا دن ہوا تو اور مصیبت آئی۔ سارا دن اسی میں بیت گیا۔ ایک انداز سے جھکائے گردن شل ہوگئی۔ داڑھی مونچھوں کو ترشوانے میں منہ کو لقوہ مار گیا۔ حجام بیچارے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا۔ پھر بھی ان کا خط مرضی کے مطابق نہ بنا۔

اب کپڑے بدلنے کی باری آئی۔ ٹوپی قالب سے اتر کر آئی۔ اور ذرا مرضی کے خلاف ہوئی تو سر پیٹ لیا مگر ایسی احتیاط سے کہ بال نہ بگڑیں۔ اس کے بعد انگرکھے کی چنٹوں پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ پھر انگرکھے کی تنگ آستینوں اور پائنچے کی پتلی پتلی موریوں سے ہاتھا پائی شروع ہوئی مگر بڑی نزاکت کے ساتھ۔ اس نازک کپڑے پر ذرا زور پڑا اور مسکا۔ ہاتھ پاؤں کہتے ہیں کہ ہم ان چیونٹیوں کے بلوں میں تو گھسنے والے نہیں۔ کاغذ کے سہارے سے ہولے ہولے پھسلاتے پھسلاتے کہیں پہروں میں جاکر مشکل آسان ہوئی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے سارا بدن شکنجے میں جکڑ دیا۔ کھانسنا، چھینکنا،

انگڑائی لینا تو دور کی بات ہے کھُل کے سانس بھی نہیں لے سکتے۔
نعیمہ میں اس طرح کی تو کوئی لت نہیں تھی مگر مزاج کی بے ڈھب تھی۔ خالہ کے گھر ڈولی سے اتری تو خالہ کو دیکھتے ہی دور سے بھوں بھوں کرکے رونے لگی۔ دیہاتی عورتوں میں تو یہ قاعدہ ہے کہ کوئی مہمان یا مسافر بہت دنوں بعد آئے تو اس سے مل کر رونے لگتی ہیں۔ یوں کہ انھیں وہ دن یاد آتے ہیں جو اس کے انتظار اور اس کی یاد میں بتائے ہیں۔ مگر دہلی کا دستور الگ ہے۔ یہاں کی عورتیں مل کر روتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جدائی کے زمانے میں کوئی عزیز مرگیا۔ ورنہ مہمان کے آنے پر رونا بدشگنی سمجھا جاتا ہے۔
خالہ نے نعیمہ کو روتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ ماں سے روٹھ کر آئی ہے۔ دوڑ کے گلے لگا لیا۔ سمجھایا کہ اللہ رکھے بیٹے کی ماں ہوئیں۔ اب تمھاری عمر بچّوں کی طرح رونے کی نہیں ہے۔ پڑوس کی عورتیں سنیں گی تو کیا کہیں گی۔ نعیمہ نے ماں کے مارنے کا گلہ کیا۔ خالہ نے سمجھایا کہ ماں باپ ہزار بار دُلار کرتے ہیں تو ایک بار نصیحت کے لیے مار بھی بیٹھتے ہیں۔ بھلا تم نے اس کا کیا خیال کیا۔ جی پر قابو رکھو۔ دیکھو تمھارا بیٹا تمھارے رونے پر ہنستا ہے۔ پھر بچے کی طرف مخاطب ہوکر بولیں ”کیوں جی بڑے میاں تم کچھ اپنی اماں جان کو نہیں سمجھاتے؟“

بچّہ : آغوں

خالہ : آغوں غوٹے۔ دودھ پی کر میاں ہوئے موٹے

اس طرح، خالہ نے نعیمہ کے رونے کو باتوں میں ٹال دیا۔ دو چار دن تو نعیمہ جھینپی جھینپی سی رہی پھر ہنسی خوشی رہنے لگی۔ بات کیا ہے تو نعیمہ کی خالہ اچھی طرح جان ہی چکی تھیں۔ اب اس نے

پکّا ارادہ کرلیا کہ نعیمہ کی خرابیوں کو دور کرکے ہی رہے گی۔ اور ہوا بھی یہی کہ خالہ کے گھر رہ کر اس کی آپ سے آپ اصلاح ہو گئی۔ اچھا صحبت آدمی کو کچھ کا کچھ کر دیتی ہے۔

یہاں کسی نے نعیمہ کو کسی طرح کی نصیحت بھول کر بھی نہیں کی مگر سب کی دیکھا دیکھی اس میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں۔ بے دینی سے اب اسے نفرت ہونے لگی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ بے دین آدمی ایسا ہے جیسے بے نکیل کا اونٹ، بے ناتھ کا بیل، بے لگام کا گھوڑا۔ بے ملّاح کی ناؤ، بے ریگولیٹر کی گھڑی، بے باپ کا بچہ، بے نگینے کی انگوٹھی، بے لالی کی مہندی، بے خوشبو کا عطر، بے باس کا پھول، بے طبیب کا بیمار اور بے آئینے کا سنگھار۔ بے دینی کی زندگی بے اطمینان اور بے سہارا زندگی ہے۔ دکھ میں کوئی تسلّی نہیں، فاقے میں صبر نہیں۔ برائی کی سزا نہیں اور نیکی کی جزا نہیں۔

پہلے نعیمہ کا یہ حال تھا، پہر پہر دن چڑھے اٹھتی تھی۔ جاگ رہی ہے تو پڑی انڈے جا رہی ہے۔ یہاں یہ ماحول تھا کہ صبح سبح سب اٹھے، ضرورتوں سے فارغ ہو کر اللہ کی عبادت میں لگ گئے۔ اس سے نمٹے تو کام کاج سنبھالا۔ نعیمہ کی وجہ سے احتیاط کی جاتی تھی مگر کہاں تک، کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ تو ضرور ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اس کی آنکھ بھی سب کے ساتھ کھلنے لگی۔ دیکھتی تھی کہ بچے کی نجاست میں لتھڑی ہوئی پڑی انگڑائیاں لے رہی ہے۔ شست، اداس، مضمحل اور نیند کے خمار سے کسل مند۔ دوسرے ہیں کہ چاق چوبند، چست و چالاک، تازہ دم، پاک صاف، خدا کی درگاہ میں شکر کے سجدے کر رہے ہیں کہ رات امن و چین سے کٹی اور دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ ہمیں اتنا رزق دے کہ چین سے کھائیں اور کسی کے آگے ہاتھ نہ

پھیلائیں۔ خدایا! بیماروں کو شفا دے، بھولے بھٹکوں کو سیدھا راستہ دکھلا، مسافروں کو امن، بھوکوں کو روزی، مایوسوں کو امید، مفلسوں کو قناعت، تونگروں کو سخاوت، بے اولادوں کو اولاد، نامرادوں کو مراد، جاہلوں کو علم دے۔ یا اللہ سارے جہان کی خیر۔

یہ ہو نہ سکتا تھا کہ اس ماحول کا نعیمہ پر اثر نہ ہوتا۔ وہ لاڈ پیار میں پلی تھی اس لیے مزاج میں ذرا برداشت نہ تھی۔ بات بے بات غصہ کرتی، جھنجھلاتی، ذرا سی تکلیف کو مصیبتوں کا پہاڑ بنا لیتی۔ ذرا سی بات ہوئی اور اس نے سب کی زندگی اجیرن کر دی۔ مگر یہاں رہ کر وہ بالکل بدل چکی تھی۔ منکسر مزاج، ملنسار، خوش اخلاق، صلح پسند، باتہذیب اور دیندار۔ اب اس کے دل کو ایک طرح کا سکون حاصل ہو گیا تھا لیکن ایک بات اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور وہ تھی ماں باپ کی نارضامندی۔

اسی دوران اللہ نے نعیمہ کا اجڑا گھر بسانے کی صورت نکال دی۔ اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن اس کی بدمزاجی اور بے دینی سے عاجز تھا۔ اس کی بے رخی دیکھ کر ساس نندیں بھی بیزار ہو گئیں۔ اب جو ان لوگوں کو پتہ چلا کہ نعیمہ کی کایا پلٹ ہو گئی تو سب کی عید ہو گئی۔ نعیمہ کا میاں ڈولی لے کر ڈرا ہوا سسرال آیا۔

نعیمہ ماں کو منانے کے لیے بے چین تو تھی ہی۔ ایک شادی میں دونوں ایک جگہ ہوئیں تو نعیمہ دوڑ کے ماں کے قدموں پر گر پڑی۔ ماں کی ممتا تو ہوتی ہی دیوانی ہے۔ وہ خود من جانے کو بیقرار تھی۔ اس نے بھی بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔ اور نہ صرف یہ کہ اس کی خطا معاف کر دی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ریجھ ریجھ کر اس کو پیار کیا۔ شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو فہمیدہ اپنی بہن بھانجی کا شکریہ ادا کر کے بیٹی کو اپنے

ساتھ لے آئی۔ گھر پہنچ کے نعیمہ نے حمیدہ کو بار بار گود میں لے کر پیار کیا۔ اور جس خادمہ کے دولتی جڑی تھی اس سے معافی مانگی۔ اس کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ سسرال چلی گئی۔

نعیمہ کو اپنے گھر آئے دوسرا مہینہ تھا کہ کلیم ادھ موا ہو کے بہن کے گھر پہنچا۔ سب نے اس کی بڑی تیمارداری کی اور نعیمہ تو سب سے آگے آگے تھی۔ دو دو ڈاکٹر اور شہر کے نامی جرّاح بڑے دھیان سے علاج کر رہے تھے مگر اس کے زخموں کا بگاڑ کم نہ ہوتا تھا۔ ہر وقت غش میں رہتا تھا۔ کبھی کبھی ذرا دیر کو ہوش آجاتا تھا۔ دیکھتا سب کچھ تھا مگر کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ مرنے سے پہلے اچانک اس کی حالت بہتر ہوگئی۔ اس نے فرمایش کرکے پلاؤ پکوایا۔ پھر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ گھر سے بھاگنے کے بعد جو کچھ اُس پر بیتی تھی وہ سب کو سناتا رہا۔ ایک ایک کا حال پوچھتا رہا۔ اپنے کیے پر پچھتاتا اور روتا رہا۔ اتنا رویا کہ ہچکی لگ گئی۔

آخر میں ماں سے مخاطب ہوکر اپنی ساری غلطیوں کا اقرار کیا۔ کہنے لگا "میں جانتا ہوں کہ اس وقت جو مجھ میں دم آگیا ہے یہ موت کے نزدیک ہونے کی پہچان ہے۔ گُل ہونے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ مگر مجھے یہ تسلّی ہے کہ میں اپنے گناہوں پر نادم، اپنی بے ادبی پر پشیمان اور اپنی بدکرداری پر شرمندہ ہوں۔ پھر مجھے یہ بھی تسلّی ہے کہ شاید میری زندگی دوسروں کے لیے سبق کا کام دے۔ اب صرف یہ آرزو باقی ہے کہ ابّا جان سے اپنا قصور معاف کرالوں۔" یہ کہہ کے اتنا رویا کہ بے ہوش ہوگیا۔ بیہوشی میں ہی سانس اکھڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں توڑنے لگا۔ نبضیں چھٹ گئیں۔ موت کی ہچکیاں آنے لگیں۔ ناک کا بانسہ پھر گیا۔

نصوح دوڑا ہوا آیا اور سر ہانے بیٹھ کر لیسین پڑھنے لگا، منہ میں شربت ٹپکایا۔ شربت کا حلق سے اترنا تھا کہ کلیم نے آنکھیں کھول دیں اور باپ کو حسرت سے دیکھ کر ہاتھ جوڑ لیے۔ اس کے بعد پھر غشی طاری ہوگئی اور ذرا دیر میں زندگی کے جھمیلے سے آزاد ہوگیا۔

کلیم بچ جاتا تو شاید اس کی زندگی لوگوں کے لیے ایک نمو نہ ہوتی کیونکہ وہ ٹھوکریں کھاکر سیدھے راستے پر آیا تھا۔ کلیم کی جوان موت ایسی بھاری تھی کہ ماں باپ اس کے ساتھ جیتے جی مر گئے۔ بھائیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ بہنوں کا بڑا سرپرست اٹھ گیا مگر سب نے صبر کیا۔

علیم نے پڑھ لکھ کر چاروں طرف علم کا اجالا پھیلایا۔ سلیم ایسا بھاری طبیب ہوا کہ آج تک نامی گرامی طبیب اس کی بیاض سے نسخے لکھتے ہیں۔ حمیدہ نے بھی علم حاصل کیا، قرآن حفظ کیا۔ حدیث پڑھی اور اب دہلی میں لکھنے پڑھنے کا جو چرچا ہے اور عورتیں اللہ رسول کے نام سے واقف ہیں تو یہ سب بی حمیدہ ہی کی بدولت ہے۔